دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی

شعور و آگہی

لاہور

جولائی تا ستمبر 2010ء • رجب المرجب ۱۴۳۱ھ • شمارہ نمبر 3 • جلد نمبر 2 • رجسٹرڈ نمبر S -370

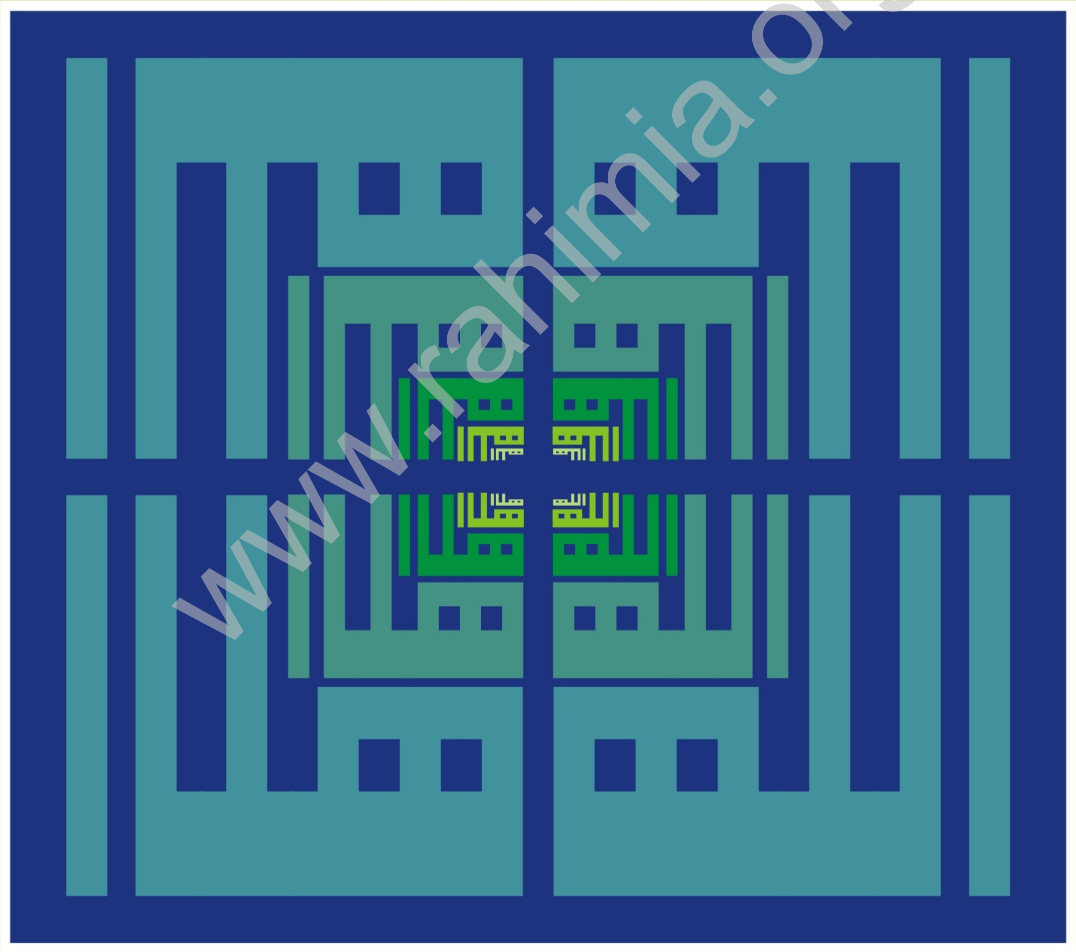

www.rahimia.org

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی، تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

جولائی تا ستمبر 2010ء / رجب تا رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ | جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۳ | رجسٹرڈ نمبر S-370

زیر سرپرستی
حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری دامت برکاتہم العالیہ

مجلس ادارت

مدیر	مدیر اعلیٰ	صدرِ مجلس
محمد عباس شاد	مفتی عبدالخالق آزاد	پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن

مشاورت

مفتی عبدالمتین نعمانی	بورے والا	پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل	سعودی عرب
مفتی عبدالقدیر	چشتیاں	پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالمقیت شاکر علیمی	کراچی
مفتی عبدالغنی قاسمی	لاہور	پروفیسر حسین احمد علوی	چشتیاں
مفتی محمد مختار حسن	نوشہرہ	پروفیسر ڈاکٹر ابرار محی الدین	بہاولپور
سید سیف الاسلام خالد	راولپنڈی	پروفیسر ڈاکٹر تاج افسر	اسلام آباد
مولانا عبداللہ عابد سندھی	شکارپور	پروفیسر محمد سعید اختر	اسلام آباد
مولانا محمد ناصر	جھنگ	پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر	لاہور

قیمت فی شمارہ: 100 روپے | سالانہ زرِ تعاون: 350 روپے

شعبہ مطبوعات
ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

org.rahimia.www:Web, ۳٦۳٦۹۰۸۹ / ۰۰۹۲-٤۲-۳٦۳۰۷۷۱٤ :Ph

مدیر اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے۔ جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ، لاہور سے چھپوا کر دفتر سہ ماہی مجلّہ ''شعور و آگہی''، رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ، لاہور سے شائع کیا۔

www.rahimia.org

اس شمارے میں

اداریہ:	حرفِ اول	مدیر اعلیٰ	3
شخصیات:	سرگزشتِ حیات (3) امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ	ترجمہ وتحقیق: مفتی عبدالخالق آزاد☆	5
تاریخ و سیاسیات:	تحریکِ خلافت	پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالمقیت شاکر علیمی☆	57
تحریکاتِ آزادی:	ایشیا کی عہد ساز قیادت (2) شیخ الہندؒ اور روحِ عصر	مولانا محمد ناصر☆	87
آرا و تأثرات:	گرامی نامے		119

تعارف مقالہ نگار

☆ **مفتی عبدالخالق آزاد**

ناظمِ اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

☆ **پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالمقیت شاکر علیمی**

پروفیسر (ر) شعبہ اردو ایس ایم سائنس کالج، کراچی

☆ **مولانا محمد ناصر**

لیکچرار شعبہ علومِ اسلامیہ، گورنمنٹ کالج، جھنگ

www.rahimia.org

اداریہ

حرفِ اول

معاشروں کی درست خطوط پر تشکیل کے لیے جہاں انسانیت کی آفاقی اقدار و روایات اور صحیح فلسفہ وفکر سے آگہی اور ان سے شعوری وابستگی کی ضرورت واہمیت ہوتی ہے، وہیں پر عصری تقاضوں کا فہم اور روحِ عصر کے مطابق صحیح حکمتِ عملی کی تشکیل بھی انتہائی ناگزیر حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ زمینی حقائق اور معروضی تقاضوں کا صحیح ادراک، روحِ عصر کو سمجھے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اور معروضی حقائق سمجھے بغیر، کی جانے والی جدوجہد اور کوشش خواہ کتنے ہی مخلصانہ طریقے اور بلند و بالا افکار و خیالات اور اعتقادات کی بنیاد پر کی جائے، پورے طور پر نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوا کرتی۔ اس لیے قوموں کی کامیابی میں عصری تقاضوں کا شعور رکھنے والی قیادت ہی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو روحِ عصر کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے ہر دور میں ''مجددین'' کی ضرورت رہی ہے۔ اسی تناظر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو سمجھا جاسکتا ہے، جس میں آپؐ نے فرمایا: ''إن الله يبعث لهٰذه الأمة على رأس كل مائة سنة من يجدّد لها دينها'' (رواہُ ابوداؤد) (کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر سو سال کے شروع میں ایسے لوگ پیدا کرتے ہیں، جو اُمت کے لیے اُس کے دین کی تجدید کرتے ہیں۔) تجدیدی کام میں بنیادی اصول اور آفاقی اقدار تبدیل نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ عصری تقاضوں کے مطابق اِن آفاقی اصولوں کی عملی صورت گری پر مبنی نظام قائم کرنے کے لیے تجدیدی کردار ادا کیا جاتا ہے۔

برعظیم پاک و ہند میں علمائے ربانیین کی اولوالعزم جماعت نے اس آخری زمانے میں ـــــ جب کہ اس خطے کے انسان ظلم و جبر، غلامی اور پستی کا شکار ہوگئے تھے ـــــ عصری تقاضوں کو بخوبی سمجھا۔ اور روحِ عصر کو سامنے رکھتے ہوئے، اس خطے کی اقوام کو زوال سے نکالنے کے لیے درست حکمتِ عملی اور صحیح طریقۂ کار وضع کیا۔ اور یوں ایک تجدیدی کردار ادا کیا۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، سید احمد شہیدؒ، شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ، حاجی امداداللہ تھانویؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، قطب عالم مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، قطب الارشاد مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ وغیرہم مجددین کی اس جماعت کے عظیم الشان افراد ہیں۔ جنھوں نے زمانے کے اُتار چڑھاؤ کا مشاہدہ کیا۔ روحِ عصر کے تقاضوں کا ادراک کیا۔ بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ لیا۔ سیاسی، معاشی تغیرات وتبدلات اور سماجی وعمرانی معاہدات کی قرارواقعی نوعیت کا تجزیہ کیا۔ اور پھر دین اسلام کے آفاقی اصولوں اور نبویؐ فلسفہ وفکر کے

www.rahimia.org

اساسی نظامِ فکر و عمل کو سامنے رکھتے ہوئے برعظیم پاک و ہند میں بسنے والی اقوام کے لیے ایسا درست لائحہ عمل اختیار کیا کہ جس سے خطے کی اقوام نے آزادی حاصل کی۔ اور غلامی سے نکل کر قومی اور ملی تقاضوں کے مطابق نظام قائم کرنے کے مواقع حاصل کیے۔ اس طرح اس اولوالعزم جماعت نے عصری تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی طے کردہ حکمتِ عملی کے مطابق بلاخوف و خطر جدوجہد کی اور بڑی قربانیاں دیں۔ آج بڑی ضرورت ہے کہ ہماری نوجوان نسل اس دور کے مطابق روحِ عصر کے تقاضوں کو سمجھے۔ اور ان حضرات کی جدوجہد اور کوشش و کاوش کا مطالعہ کرے۔

اس تناظر میں اس شمارے میں تین اہم مقالات پیش کیے جا رہے ہیں۔ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی اپنی خودنوشت سرگزشتِ حیات کا ایک اہم حصہ پیش کیا جا رہا ہے، اس حصے میں انھوں نے ولی اللّٰہی جماعت کی تشکیل اور اس کی جدوجہد کا عصری تقاضوں کے تناظر میں جائزہ لیا ہے۔ اور یہ واضح کیا ہے کہ ہر دور میں ولی اللّٰہی طریقۂ فکر و عمل کی حامل جماعت نے بدلتے دور کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی حکمتِ عملی ترتیب دی۔ نیز اس مقالے سے اس بات کی نشان دہی بھی ہوتی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اپنے دور کے معروضی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے کس نوعیت کا تجدیدی کام کیا ہے۔ اس تجدیدی کام کے بنیادی اساسی اصول، اس کا نظامِ کار اور اس کے مقاصد و اَہداف کیا تھے۔ اور پھر ان تمام تجدیدی اُمور کو رُوبہ عمل لانے کے لیے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی جدوجہد کا رُخ کیا رہا۔ اور آپ نے اس کے لیے کیا اقدامات کیے۔

اس شمارے کا دوسرا مقالہ ''تحریکِ خلافت'' کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ جس میں اس تحریک کے بنیادی خدوخال، کام کرنے کے انداز اور تحریک کے مقاصد و اہداف کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس حقیقت کی نشان دہی کی گئی ہے کہ برطانوی سامراج کی جانب سے خلافتِ اسلامیہ کے خلاف ہونے والی سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے عصری تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے خطے کی غیر مسلم اقوام کے ساتھ مل کر قومی آزادی کی جدوجہد کو کیسے منظم کیا گیا۔ اور برعظیم پاک و ہند کی اولوالعزم قومی قیادت نے ظلم و جبر اور غلامی کے خلاف جدوجہد اور کوشش کے لیے کتنی عظیم قربانیاں دی ہیں۔ اس طرح تحریکِ خلافت ہماری آزادی کی جدوجہد میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس شمارے کا تیسرا مقالہ ''شیخ الہندؒ اور روحِ عصر'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں حضرت شیخ الہندؒ کی اس جدوجہد کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ جو انھوں نے جنگِ عظیم اوّل میں خلافتِ اسلامیہ کی شکست و ریخت کے بعد ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کو روحِ عصر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے کی تھی۔ اس مقالے میں 1920ء کے بعد کے زمانے میں ہندوستان کی قومی جدوجہدِ آزادی کے لیے حضرت شیخ الہندؒ نے جن تجدیدی اصولوں اور ضابطوں کا تعین کیا، اور عدمِ تشدد کی بنیاد پر جدوجہد کی، اس کی عصری اہمیت واضح کی گئی ہے۔ اور پھر تسلسل کے ساتھ اس حکمتِ عملی پر جدوجہد کرنے والی جماعت کا تعارف بھی کرایا گیا۔ آخر میں آرا و تأثرات کے حوالے سے چند گرامی نامے شامل اشاعت ہیں۔ اُمید ہے کہ قارئین ہمیں اپنی آرا سے آگاہ فرمائیں گے۔ (مدیرِ اعلیٰ)

www.rahimia.org

شخصیات

سرگزشتِ حیات

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ

''تحدیث العبد الضعیف بنعمة ربه اللطیف''

(عربی خودنوشت سوانح کا اُردو ترجمہ)

ترجمہ وتحقیق: مفتی عبدالخالق آزاد

(3)

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ایک عظیم الشان کتاب ''التمهید لتعریف آئمة التجدید'' تحریر فرمائی ہے۔ یہ کتاب آپ نے 1930ء میں مکۃ المکرّمہ میں لکھی تھی۔ جس میں آپ نے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ اور حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ سے لے کر اپنے استاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن قدس سرہ تک اس دور کے مجددین کے سلسلۂ افکار و تعلیمات اور سلسلۂ اسناد و تسلسل کا تعارف پیش فرمایا ہے۔

آپ کی یہ اہم ترین تصنیف چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا حصہ ''تحدیث العبد الضعیف بنعمة ربه اللطیف'' (ایک کمزور بندے پر، مہربان رب کے انعامات کا تذکرہ) کے عنوان سے ہے، جس میں حضرت سندھیؒ نے نہ صرف اپنی خودنوشت سوانح لکھی ہے، بلکہ حضرت شیخ الہندؒ اور ہزارۂ دوم کے مجددین سے اپنے تعلق اور ان کے تجدیدی اَفکار کی وضاحت بیان کی ہے۔ نیز مسلمان ملکوں کی تاریخ کا بھرپور تجزیہ اور تحقیقی جائزہ لیا ہے۔

اس کتاب کی علمائے کرام کے نزدیک ہمیشہ سے بہت زیادہ اہمیت رہی ہے۔ چناں چہ مولانا عبدالحئیؒ لکھنوی نے (والد گرامی مولانا ابوالحسن علی ندویؒ) نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کتاب کی اہمیت اور مولانا سندھیؒ کے فکر اور نظریے کی وسعت بیان کی ہے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تالیفات میں سب سے بہترین کتاب عربی زبان میں لکھی گئی ''التمهید فی آئمة التجدید'' ہے۔ جسے انھوں نے مکہ مکرمہ میں تالیف کیا تھا۔ اور شاہ ولی اللہؒ پر ایک مقالہ (شاہ ولی اللہؒ کی حکمت کا اجمالی تعارف) جو ماہنامہ ''الفرقان'' کے خاص نمبر کے لیے لکھا تھا، یہ دونوں تالیفات مولانا سندھیؒ کے وسعتِ نظر اور فکری گہرائی پر دلالت کرتی ہیں''۔

آئندہ صفحات میں اس کتاب کے دوسرے حصے کا اُردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا سندھیؒ نے اپنی اس خودنوشت سوانح میں اپنے حالاتِ زندگی، اپنے فکر و عمل کی تشکیل اور اس کے تدریجی ارتقا کی تفصیل بیان کی ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سندھیؒ شریعت میں ایک پختہ کار عالم ربانی، طریقت کے میدان کے شناور اور بہت سے مشائخ سے اجازت یافتہ ہیں۔ نیز سیاست کے میدان میں ایک سچے اور مخلصانہ کردار ادا کرنے والے بے باک قائد، جرأت مند اور بہادر رہنما کے طور پر انقلابی کردار ادا کرنے والے اہم رہنما ہیں۔

یہ کتاب اُردو زبان میں لکھی ہوئی خودنوشت سوانح سے زیادہ جامعیت کی حامل اور ممتاز ہے۔ مولانا سندھیؒ کی سوانح کا اشتیاق رکھنے والے لوگوں کے لیے اس میں بہت سی نئی اور مفید باتیں آگئی ہیں۔ اس کی پہلی اور دوسری قسط گزشتہ شماروں میں آچکی ہے۔ اب تیسری قسط پیشِ خدمت ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔

باب (8): اُمّ القریٰ (مکہ مکرمہ) میں قیام

فصل نمبر (1): مکہ مکرمہ میں قیام کی نوعیت

کاش میں ۱۳۴۴ھ (جون 1926ء) کے موسمِ حج میں اُمّ القریٰ (مکہ مکرمہ) پہنچ جاتا۔ تو ہندوستان سے آنے والے اپنے ان ہندوستانی دوستوں کے اجتماع میں شریک ہوجاتا، جو "مؤتمر اسلامی" میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ہماری باہمی ملاقات اور مذاکرات کا عمل پورا ہوجاتا تو ہمارا سیاسی پروگرام پہلے سے زیادہ مہارت اور عمدگی لیے ہوتا، لیکن میں صفر ۱۳۴۵ھ (15 اگست 1926ء) کو اس وقت مکہ مکرمہ پہنچا، جب کہ ہمارے دوست واپس ہندوستان لوٹ چکے تھے۔

مکہ آنے کے بعد کچھ دن میں نے عرب رہنماؤں کے بیانات اور ان کی آرا اور عرب تحریک کی تاریخ کے مطالعے میں گزارے تھے۔ اس مطالعے سے میرے اس فکر میں کوئی تغیر وتبدل واقع نہیں ہوا، جو استانبول کے قیام میں، مَیں نے اپنے لیے مقرر کرلیا تھا۔ بلکہ میرے سامنے سے چند ایسی غبار آلود باتوں سے پردہ ہٹا، جن کا تعلق عربوں اور ترکوں کے باہمی اختلاف کے اسباب سے تھا۔ چناں چہ میں نے لوگوں کے سامنے اس بات کی صراحت کردی کہ میں ہندوستان کے پروگرام پر ہی کام کروں گا۔ اور سیاستِ عربیہ سے میرا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ (1)

میرا مطمحِ نظر؛ تعلیم وتربیت اور تنظیم

اسی دوران مَیں نے ایک خواب دیکھا کہ ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ مجھ سے فرما رہے ہیں کہ: ''تم جب آگ جلالو، اور روٹی پکالو، تو میں تمھیں اپنی جماعت میں ضم کردوں گا۔ اور تمھیں اپنی جماعت میں سے بنالوں گا۔'' اس خواب کی تعبیر کے سلسلے میں میرے دل میں یہ خیال آیا کہ آگ جلانے سے مراد "جہاد بالسیف" ہے۔ اور روٹی پکانے سے مراد ایسی تعلیم وتربیت اور تنظیم کا قیام ہے، جو دنیا وآخرت کی برکات سمیٹنے والی ہے۔ جب سے میں اس وادیٔ غیر ذی زرع (مکہ مکرمہ) میں پہنچا ہوں اور بیت اللہ الحرام کے سائے میں رہنے لگا ہوں، تو میرا مطمحِ نظر ''روٹی پکانا'' (یعنی تعلیم وتربیت اور تنظیم) ہی رہا ہے۔

فصل (2): تاریخ اسلام کا مطالعہ

اس طرح میں اپنے اکثر اوقات تاریخ اسلام کے مطالعے میں خرچ کرنے لگا۔ پھر ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ ان نظریات کے حوالے سے کرنے لگا، جو ہم نے اپنے سیاسی پروگرام کے حوالے سے قائم کیے تھے۔ اس بات

www.rahimia.org

کے باوجود کہ ضروری کتابوں کا ذخیرہ ایک جگہ پر اکٹھا نہ ملنے کی وجہ سے بہت سی رُکاوٹیں حائل تھیں۔ نیز دل اس وجہ سے بھی پریشان رہتا تھا کہ ہندوستان کے رہنے والوں میں دن بدن بزدلی اور کم ہمتی بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسے حالات میں تصوف سے لگاؤ رکھنے والی ایک جماعت میں نے ایسی دیکھی، جس کا رُجحانِ فکر اِن افکار کی طرف تھا۔

فلسفہ اور حکمت کے بارے میں البیرونی کی رائے

ابوریحان البیرونی نے لکھا ہے:

''فلسفہ اور حکمت کے ظہور سے پہلے قدیم یونانیوں میں ایسے سات لوگ گزرے ہیں، جنھیں ''أساطين الحكمه'' (حکمت کے ستون) کہا جاتا ہے۔.......(2)

ان کے نزدیک ـــــ بعد میں پیدا ہونے والے فلاسفہ کے مقابلے پر ـــــ فلسفے کی تہذیب و ترتیب ہندوستانی فلاسفہ کے طے کردہ اصولوں کے طرز پر تھی۔ ان میں سے کچھ لوگ:

(1) ایسے ہیں جو کہ تمام اشیا کو شئ واحد (وحدت الوجود) کے طور پر دیکھتے تھے۔

پھر ان میں بھی درجِ ذیل گروہ تھے:

(الف) بعض ''کونیاتی وحدت'' کے قائل تھے۔

(ب) اور بعض ''قوت وطاقت کی وحدت'' کے قائل تھے۔

اور یہ کہ مثلاً انسان، پتھر اور دیگر تمام جامد چیزوں سے صرف اس لیے فضیلت رکھتا ہے کہ وہ مرتبے کے اعتبار سے ''علتِ اولیٰ'' کے قریب تر ہے۔ ورنہ وہ بعینہٖ وہی ہے۔

(2) اور بعض لوگ ایسے تھے، جو کہ ''علتِ اولیٰ'' کے اعتبار سے صرف ''وجودِ حقیقی'' کو ہی اصل سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ وہ اپنے ذاتی وجود میں دیگر تمام اشیا کے محتاج نہیں ہیں۔ اور دیگر تمام چیزیں اس کی محتاج ہیں۔ اور جو چیز اپنے وجود کے لیے دوسرے کی محتاج ہو، تو اس کا وجود محض ایسا خیال ہے، جو غیر حقیقی ہے۔ اور حق صرف وہی ''واحدِ اول'' ہی ہے۔

یہ تمام آرا ''سوفیہ'' یعنی ''حکما'' کی ہیں۔ اس لیے کہ یونانی زبان میں ''سوف'' کا معنیٰ ''حکمت'' ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کا نام ''فیلسوف'' (پیلا سوپا) رکھا گیا۔ یعنی ایسے لوگ، جو حکمت اور فلسفے سے محبت رکھتے ہیں۔ اور جب ایسی قوم اسلام میں داخل ہوئی، جو اپنی رائے ان لوگوں کے قریب قریب رکھتی تھی تو ان کا نام بھی یہی رکھ دیا گیا۔'' إنتهٰی (3) ایسے ہی عبدالعزیز الاسلامبولی نے ''معرفت'' میں ذکر کیا ہے۔ ولِلّٰہ الحمد۔

www.rahimia.org

تصوف، حکمت اور احسان کی حقیقت

میری تحقیق کے مطابق ''صوفیا'' کا لفظ یونانی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کا معنی ''حکمت'' ہے۔ اور جو لوگ اسے عربی زبان کا لفظ قرار دیتے ہیں، اور اس کو ''صوف'' (اُون) یا ''صفا'' (پاکیزگی اور صفائی) سے مشتق بنانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بڑی دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ پھر یہ لفظ ''صوفیا'' مسلمانوں کے عرف میں ''عارف'' کے معنی کے لیے مخصوص ہوگیا۔ یعنی ایسا عالم جو ''حکمتِ الٰہیہ اشراقیہ'' کی معرفت رکھتا ہو۔ جیسا کہ ''متکلم'' کا لفظ ایسے عالم کے لیے بولا جاتا ہے، جو ''حکمتِ الٰہیہ مشائیہ'' کی معرفت رکھتا ہو۔

لیکن بعض اہلِ علم کو یہاں پر بڑا شبہ لگا کہ انھوں نے ''احسان'' کو ''تصوف'' کے مشابہ اور ''عقائد'' کو ''کلام'' کے مشابہ سمجھ لیا۔ اس لیے کہ انھوں نے جب مسلمانوں کے اماموں میں سے ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ ''احسان'' اور ''تصوف'' کو جمع کر کے بیان کرتے ہیں، جب کہ ایک دوسری جماعت کو دیکھا کہ جو ''عقائد'' اور ''کلام'' کو جمع کر کے بیان کرتے ہیں۔ تو وہ ان دونوں میں فرق و امتیاز نہ سمجھ سکے۔ اس طرح ان پر غلط رائے کا خبط (سودا) سوار ہوگیا۔ جب کہ امام ولی اللہ دہلویؒ نے ان مباحث کے ایسے تمام شبہات کا ازالہ کر دیا ہے۔ اور پردۂ خفا میں پڑی ہوئی چیزوں کو اچھی طرح کھول کر بیان کر دیا ہے۔

صوفیا اور حکما کی جدوجہد کا مطالعہ

خلیفہ مامون الرشید عباسی کے زمانۂ خلافت کے قریب اشراقی حکمتِ الٰہیہ کے متحققین کی اسلام میں داخل ہونے کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس زمانے میں صوفیا میں جتنے بھی ''اصحابِ صحو'' (یعنی صاحبِ ہوش و حواس) تھے۔ انھوں نے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کی طرف رجوع کیا ہوا تھا۔ جب کہ انھوں نے حضرت سری سقطیؒ کی صحبت اُٹھائی تھی۔ اور انھوں نے حضرت معروف کرخیؒ کی صحبت اُٹھائی تھی۔ اور انھوں نے حضرت علی رضا بن موسیٰ کاظمؒ کی صحبت اُٹھائی تھی۔

جب کہ ''اصحابِ سُکر'' (بے ہوشی اور جذب کی حالت والے لوگوں) کا مرجع سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ تھے، جنھوں نے حضرت جعفر صادق بن موسیٰ کاظمؒ کی صحبت اُٹھائی۔ اور جنھیں شیعہ امامیہ ''جعفر کذاب'' کا نام دیتے ہیں۔ اس بات کی صراحت امام عبدالعزیز دہلویؒ نے کی ہے۔

حکما کی اس جماعت کا اہم ترین مشغلہ سیاستِ اجتماعیہ میں گہرے طور پر داخل ہونا تھا۔ چناں چہ میں دیکھتا ہوں کہ اہلِ علم کی دو قسمیں ہوگئی ہیں:

1۔ بعض اہلِ علم وہ تھے، جو ارتقائی سوچ رکھتے تھے۔ ان کے سیاسی نظریات حکومتِ وقت کے موافق تھے۔ یہ جماعت حکومت میں شامل ہوگئی۔ اور یہ لوگ قضا وغیرہ ایسے عدالتی اور حکومتی کاموں میں داخل ہوگئے۔

2۔ دوسری جماعت انقلابی خیالات رکھنے والی تھی۔ اور ان کے سیاسی نظریات حکومتِ وقت سے موافقت نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے ''تصوف'' کا دامن تھام لیا۔ اس طرح ان کے لیے مذاہب اور رسومات کی قیودات کے بغیر غور وفکر کرنا آسان ہوگیا۔ ان کے اردگرد ایسے لوگ جمع ہونے لگے، جو حکومتوں کے ظلم کی وجہ سے تکالیف میں مبتلا اور شکست خوردہ تھے۔ انھیں عام مسلمانوں میں خفیہ اور علانیہ طور پر اپنے افکار پھیلانے کا موقع مل گیا۔ اور یہ سب کچھ انھوں نے علوی حضرات سے حاصل کیا۔ اس لیے کہ وہ بنواُمیہ کے ابتدائی زمانے سے ہی حکومت مخالف سیاست کا مرکز اور انقلاب کا منبع تھے۔

فصل (3): چھٹی صدی ہجری کے صوفیا کی جدوجہد

چھٹی صدی ہجری میں، جب کہ خلافتِ عربیہ کی کمزوری کا زمانہ شروع ہوگیا تھا۔ اور اسلام کی مرکزی قوت عجم کی طرف منتقل ہوچکی تھی۔ شیخ امام عبدالقادر جیلانی حسینی بغدادی قدس سرہ پیدا ہوئے۔ آپ ''**فاتح دورة جديدة في الجمع بين الإحسان والتصوف**'' یعنی تصوف واحسان کو باہم جمع کرنے کے حوالے سے ایک نئے دور کا آغاز کرنے والے ہیں۔ اس دور کے اکثر امام ایسے ہیں کہ جن پر ''احسان'' کا غلبہ ہے۔ جب کہ ایک جماعت ایسی ہے کہ ان پر ''تصوف'' کا غلبہ ہے۔

اس دور کے اماموں میں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی البغدادی، شیخ عبدالخالق غجدوانی، شیخ نجم الدین کبریٰ، شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ معین الدین چشتی اجمیری پہلی جماعت میں شامل ہیں۔ جب کہ شیخ شہاب الدین ''**المقتول**'' اور شیخ محی الدین محمد بن علی ابن عربی دوسری جماعت میں سے ہیں۔ ان میں امام معین الدین چشتی قدس سرہ نے ۵۶۱ھ (1166ء) میں اُس سال ہندوستان کا سفر کیا، جب کہ امام عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کا انتقال ہوا تھا۔ آپ ہندوستان کے مغربی حصے ''اجمیر'' میں تشریف فرما ہوئے۔ حضرت شیخ چشتی اجمیری ہندوستان میں اسلامی سیاست کی روح کا منبع اور نظامِ تعلیم وارشاد کا مرکز ہیں۔ آزاد بلگرامی ''**مآثر الکرام**'' میں لکھتے ہیں:

> ''سلطان شہاب الدین غوری کو دہلی کے والی رائے پتھورا پر فتح ہوئی۔ یہ سب حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ کے انفاسِ مبارکہ کے سبب ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت خواجہ غزنی کی جانب سے اجمیر میں تشریف فرما ہوئے اور اس مقام میں قیام فرمایا تو اس وقت رائے پتھورا کی جانب سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچی۔ حضرت خواجہؒ نے اس سے مسلمانوں کی سفارش کی۔ غیر سعادت مند رائے پتھورا کو آپ کی یہ سفارش قبول کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ اور اس نے کہا: ''یہ مرد اس جگہ آیا ہے۔ اور غیب کی باتیں بیان کرتا ہے۔'' حضرت خواجہ صاحب اس پر ناراض ہوئے۔ اور یہ جملہ آپ کی زبانِ مبارک پر آیا: ''پتھورا کو ہم زندہ گرفتار کریں گے۔ اور اس کو ہم سزا دیں گے۔''

www.rahimia.org

انھیں دنوں میں سلطان شہاب الدین غوری غزنی سے پہنچا۔ پتھورا اپنے بہت زیادہ غرور کے ساتھ مقابلے پر صف آرا ہوا۔ دونوں کے درمیان شدید لڑائی ہوئی۔ سلطان کام یاب ہوا۔ اور پتھورا کو زندہ گرفتار کیا گیا۔ اور پھر قتل کر دیا گیا۔ اسی وقت سے اس علاقے میں اسلام کی بنیاد مستحکم ہونا شروع ہوئی۔ اور کفر کی بنیاد روز بروز ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی رہی۔ چناں چہ اسی وجہ سے حضرت خواجہ قدس سرہ کو ساتویں صدی کا مجدد کہا جاتا ہے۔'' اِنتھیٰ (4)

فصل (4): ہندوستان کی تاریخ اور صوفیا کی جدوجہد کا مطالعہ

آزاد بلگرامی نے ''سبحۃ المرجان'' میں لکھا ہے:

''ہندوستان کی فتح ولید بن عبدالملک کے زمانۂ خلافت میں محمد بن قاسم ثقفی کے ہاتھوں 92ھ (711ء) میں ہوئی۔ اور اس کی فوج پر لہرانے والے جھنڈے سندھ کی حدود سے نکل کر قنوج کے آخری حصے تک 95ھ (714ء) میں پہنچ گئے تھے۔ اور جب ہندوستان کے مسلمان اُمرا اپنے علاقوں میں واپس لوٹ آئے تو خلفائے مروانیہ (بنو اُمیہ) اور خلفائے عباسیہ کے زمانے کے حکمرانوں کی حکومت صرف سندھ کے علاقوں پر باقی رہ گئی تھی۔

سلطان محمود غزنوی نے چوتھی صدی کے اواخر میں ہندوستان کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ اور وہ کئی دفعہ یہاں آیا۔ آخرکار اس نے یہاں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اور یہاں سے غنائم وغیرہ حاصل کیں۔ یہاں تک کہ قادر باللہ بن مقتدر باللہ عباسی کی جانب سے سندھ پر حکمرانی کرنے والے حکمرانوں سے سندھ بھی چھین لیا، لیکن سلطان محمود غزنوی نے خود ذاتی طور پر ہندوستان میں قیام نہیں کیا۔ اور اس کی اولاد بھی صرف غزنی سے لاہور تک کے علاقے پر حکمران رہی۔

یہاں تک کہ سلطان معز الدین سام غوری نے غزنی پر قبضہ کر لیا۔ اور پھر لاہور کے علاقے تک کا حکمران ہوگیا۔ اس نے غزنوی بادشاہوں کے آخری حکمران خسرو ملک کو معزول کر دیا۔ اور پورے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اور 589ھ (1193ء) میں دہلی کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس تاریخ سے ہندوستان کے اکثر علاقے سلاطین اسلامیہ کے ماتحت ہوگئے۔'' اِنتھیٰ (5)

صوفیا کی ہندوستان آمد

میں کہتا ہوں کہ اسی سال دہلی میں حضرت شیخ قطب الدین (بختیارِ کاکیؒ) الاوشی تشریف فرما ہوئے، جو کہ امام معین الدین اجمیریؒ کے اصحاب میں سے ہیں۔ اور ان دونوں کے صحبت یافتہ بزرگوں میں سے حضرت شیخ فریدالدین (گنج شکر) اجودھنی (پاکپتن شریف والے) ہیں، جنھوں نے حضرت سیف الدین باخرزی سے فیض

www.rahimia.org

حاصل کیا۔ اور انھوں نے حضرت شیخ نجم الدین کبریٰ شہید سے فیض حاصل کیا۔ اور اسی طرح انھوں (حضرت فرید الدین گنج شکرؒ) نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے بھی اخذِ فیض کیا ہے۔

پھر شیخ فریدالدین کے صحبت یافتہ لوگوں میں شیخ نظام الدین دہلویؒ ''سلطان المشائخ'' ہیں۔ پھر ان کے صحبت یافتہ شیخ نصیرالدین محمود دہلویؒ ہیں۔ یہ تمام لوگ افرادِ کامل اور آئمہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بلگرامی ''سبحة المرجان'' میں لکھتے ہیں:

''شیخ نصیرالدین محمود اور ان کے اکثر خلفا (اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے) کا طریقہ کار شریعتِ نبویہ کی سنتوں کی حفاظت اور علومِ دینیہ کی تعلیم و تدریس میں مشغولیت پر مبنی تھا۔ شیخ کہا کرتے تھے: ''کسی شرعی مسئلے میں غور وفکر کرنا، عُجب اور ریا سے ملی ہوئی ہزار رکعت پڑھنے سے افضل ہے۔'' شیخ نصیرالدین محمود کا انتقال 18 رمضان المبارک 757ھ (14 ستمبر 1356ء) اشراق کے وقت ہوا۔ اور وہ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین بدایوانی دہلویؒ کے سچے خلیفہ اور ان کے جانشین تھے۔(6)

فصل (5): مشائخ چشتیہ نظامیہ اور چشتیہ صابریہ

حضرت شیخ فریدالدین اجودھنی (گنج شکر) کے خلفا میں حضرت شیخ علاؤالدین صابرؒ ہیں۔ اور ان کے خلفا میں شیخ شمس الدین (تُرک) پانی پتی ہیں۔ پھر ان کے اصحاب میں شیخ جلال الدین عثمانی پانی پتی ہیں۔ اور ان کے خلفا میں شیخ عبدالحق ردولوی ہیں۔ یہ تمام برگزیدہ اماموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جو لوگ حضرت سلطان المشائخ (خواجہ نظام الدین اولیاؒ) کی طرف نسبت رکھتے ہیں، انھیں ''نظامیہ'' کہا جاتا ہے۔ اور جو لوگ حضرت علاؤالدین (صابر) کی طرف نسبت رکھتے ہیں۔ انھیں 'صابریہ' کہا جاتا ہے۔

''نظامیہ'' جماعت میں سے حضرت شیخ سراج الدین الاودھی ہیں۔ پھر ان کے خلفا میں شیخ علاؤالدین لاہوری ثم بنگالی ہیں۔ پھر ان کے خلفا میں ان کے صاحبزادے شیخ نورالدین، قطب العالم ہیں۔ پھر ان کے اصحاب میں شیخ حسام الدین مانک پوری ہیں۔ یہ تمام اکابرین مشائخ میں سے ہیں۔ انھوں نے مشرقی ہندوستان سے لے کر چین کی سرحد تک اسلام کی اشاعت میں بہت زیادہ جدوجہد اور کوشش کی ہے۔

فصل (6): مشائخ سہروردیہ

اس طرح اس زمانے میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلفا میں شیخ الاسلام حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی ہیں۔ اور ان کے بڑے اصحاب میں سے ان کے بیٹے حضرت شیخ صدرالدین عارف ملتانی اور سید جلال الدین بخاری اُچیؒ (اُچ شریف والے) ہیں۔ اور ان دونوں کے اصحاب میں ان کی اولاد میں شیخ رکن الدینؒ ملتانی (شاہ رُکن عالم) اور سید احمد کبیرؒ (بخاری) ہیں۔ انھوں نے حضرت شیخ نصیرالدین دہلویؒ سے بھی اخذِ فیض کیا ہے۔

www.rahima.org

یہ تمام حضرات ہندوستان میں ''شیوخُ الاسلام'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور انھیں کے ذریعے سے مغربی ہندوستان میں دریائے سندھ کے دونوں اطراف میں کشمیر سے لے کر بحر محیط (بحیرۂ عرب) تک دعوتِ اسلام خوب پھیلی ہے۔

فصل (7): مشائخ چشتیہ و سہروردیہ کا طریقۂ تعلیم و تربیت

سلسلہ عالیہ چشتیہ اور سہروردیہ میں شیخ شہاب الدین سہروردی کی کتابوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ''عوارف المعارف'' ہے۔ اور اسی طرح حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کی کتابوں پر بھی اعتماد کیا جاتا ہے۔ چشتی اور سہروردی حضرات ان دونوں بزرگوں کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بڑے متبعین میں شمار کرتے ہیں۔

پھر نویں صدی ہجری میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے ایک جماعت پیدا ہوئی، جن میں حضرت شیخ محمد اُچی (اُچ شریف والے) اور ان کے بیٹے حضرت شیخ عبدالقادر ثانیؒ تھے۔ لوگوں نے ان کی اتباع اور پیروی اختیار کی۔

اس طرح (نقشبندی سلسلے کے مؤسس اول) حضرت شیخ عبدالخالق غجدوانی کی اتباع کرنے والوں میں حضرت شیخ عبیداللہ احرار کے صاحبزادگان تھے۔ وہ بھی لوگوں کو رشد و ہدایت اور تعلیم و تعلّم سکھانے میں مشغول رہے۔

اس طرح ہندوستان میں صوفیا کے طریقوں میں سب سے پہلے سلسلۂ چشتیہ اور سلسلۂ سہروردیہ مستحکم اور مضبوط ہوئے۔ پھر سلسلۂ قادریہ اور سلسلۂ نقشبندیہ کو فروغ حاصل ہوا۔ ان کی اکثریت پر حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کا فکر غالب رہا۔ ان سے میں جو زیادہ مہارت رکھتے تھے، انھوں نے ان کے فکر و فلسفے کو ظاہر شریعت اور فقہ کے ساتھ تطبیق دی۔ اور اس کی توجیہات و تفصیلات بیان کیں۔ اس سلسلے میں وہ یونانی فلاسفہ کی کتابوں سے بھی مدد لیتے تھے۔ اور بہت کم ایسے لوگ تھے، جو قطعی طور پر ہندوستان کے حکما سے ہی مسائل اخذ کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔

فصل (8): ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے استحکام میں تاخیر کی وجوہات

کیا تم اس بات کی حکمت سمجھتے ہو کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کے مستحکم ہونے میں تاخیر کیوں ہوئی؟ حال آں کہ مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری میں ہی ہندوستان فتح کر لیا تھا، لیکن ان کی سلطنت کہیں ساتویں صدی ہجری میں جا کر مضبوط اور مستحکم ہوئی۔

منشی ذکاء اللہ کا تجزیہ

اس سوال کے جواب کے سلسلے میں منشی ذکاء اللہ دہلویؒ نے ''تاریخ ہندوستان'' میں یہ لکھا ہے:

''ہندوکش سے مغرب کی طرف ایشیا میں اور افریقہ اور جنوبی یورپ میں سپین اور پرُتگال تک اسلام کے اعلامِ فتح و ظفر قائم ہوگئے۔ مگر پنجاب میں ایک چپہ زمین کا، قدم کے پنجے کے برابر بھی مسلمانوں کو نہیں ہاتھ لگا۔ اتنے عرصے تک جو توقف (تاخیر اور ٹھہراؤ) ہندوستان کی فتح میں ہوا۔

(الف) اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ہند میں بعض قومیں بڑی جواں مرد اور دلاور رہتی تھیں۔
(ب) دوسرا سبب یہ ہے کہ ہندوؤں کے راج کا جنگی انتظام ایسا مسلسل تھا کہ وہ بے گانہ حملہ آوروں کو بڑے اُلجھیڑے میں پھنسا کر، اُن کو کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا۔ ہندوستان کو ''بندھیا چل'' پہاڑ نے دو شمالی اور جنوبی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ''بندھیا چل'' کے شمال میں تین گروہوں کے راجا، راج کرتے تھے۔
(1) سندھ کے میدانوں اور جمنا کے اوپر کے حصوں میں راجپوت سلطنت کرتے تھے۔ سنسکرت میں جس ملک کو ''مدھیا دیش'' (زمین متوسط) کہتے ہیں۔ وہ بڑے پہلوان راجوں میں منقسم تھا۔ اور ان راجوں کے راجاؤں کا مہاراجا، قنوج کا مہاراجا تھا۔
(2) دریائے گنگ کے زیریں وادی میں بدھ مذہب کے راجا پال کے خاندان کے لوگ راج کرتے تھے۔ بنارس سے بنگال کے ڈیلٹا کے ملک انھیں کی قلم رو میں تھا۔
(3) بندھیا چل کے دکن میں بڑے بڑے راجے رہتے تھے۔ ان کے تین گروہ تھے:
(الف) چیرا (ب) چولا (ج) پانڈیا۔ یہ بھی اس ملک میں بادشاہی کرتے تھے۔
ان راجوں کے مجموعے کا گروہ خواہ وہ اُتّــر (شمال) میں ہو یا دکن (جنوب) میں، آپس میں اتفاق کر کے بے گانہ حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کر لیتا تھا۔ جب یہ کئی گروہ اور ان کے افراد متفق ہو جاتے تھے تو ان کا فتح کر کے مغلوب کرنا اور بھی تکان اور محنت و مشقت کا کام ہو جاتا تھا۔ اگر ان گروہوں کے مجموعے پر فتح بھی حاصل کر لی جاتی تھی تو پھر ہر گروہ سے اور ہر گروہ کے افراد سے جدا جدا لڑنا پڑتا تھا۔ پھر بعد فتح بھی ہر راج میں سرکشی اور گردن کشی کا مادہ موجود رہتا تھا۔
یہی سبب ہے کہ سندھ میں باوجود سخت سعی اور کوشش کے مسلمانوں کی سلطنت کی ترقی بڑی آہستہ آہستہ ہوئی۔'' (7)

اس تجزیے کا تنقیدی جائزہ

میرا کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کے جنگی نظام کے حوالے سے یہ جواب قطعاً درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ جو قومیں ہندوکش کے پار رہتی تھیں، وہ بہادری اور جنگی نظام کے حوالے سے ہندوستانی اقوام سے کم تر نہیں تھیں۔ اگر یہ بات درست مان لی جائے، جیسا کہ فاضل اُستاذ نے لکھا ہے تو پھر امیر محمد بن قاسم ثقفی نے تین سال کی مدت میں شمالی ہندوستان کا 2/3 حصہ کیسے فتح کر لیا تھا۔
اس رائے کی کمزوری اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستانی اقوام کسی طرح بھی متحد نہیں ہیں۔ نہ زبان ایک، نہ دین ایک، نہ نسل ایک۔ پھر وہ کون سی چیز ہے، جو جنگ کے وقت ان کے بکھرے

www.rahimia.org

ہوئے افراد میں ربط و ضبط پیدا کرتی ہے۔

ہندوستان میں حکومتِ اسلامی کے استحکام میں تاخیر کا اصل سبب

بہر حال (اگر ان وجوہات کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو) مسلمانوں کا ایک طویل عرصے تک پیچھے رہنے کی وجوہات صرف وہ نہیں ہیں، جن کا مؤرخ نے تذکرہ کیا ہے۔ بلکہ میرے خیال میں اس کے علاوہ بھی ایک بڑی اہم ترین وجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ ہندوستان کے عام و خاص کے ذہنوں میں ''فلسفۂ وحدت الوجود'' پر پختہ یقین غالب ہے۔ اس خطے کے تمام مذاہب کا ادارتی نظام اور قومیت و وطنیت کے تمام دائرے، بہت سے اختلافات کے باوجود، قدیم زمانے سے اس فلسفے پر مبنی ہیں۔ اس فلسفے پر پختہ یقین و اعتماد، تمام ہندوستان کے لوگوں میں مساوی سطح پر پایا جاتا ہے۔

مسلمانوں نے ابتدائی زمانے میں اگرچہ اپنی عسکری قوت اور اپنے انقلابی نظام کی بدولت ہندوستان کی حکومت پر غلبہ پا لیا تھا، لیکن وہ ہندوستانیوں کے علوم و افکار اور فلسفہ و فکر پر مبنی اُن کی ذہنیت کے مطابق اسلام کی تعبیر پیش کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔ تاکہ ہندوستانی لوگ اسلام کی صحیح حقیقت سمجھنے کے لیے ان کے قریب آتے۔

ایران اور ترکستان میں اسلامی حکومت کے استحکام کا سبب

جہاں تک عجم کے شہروں، ایران اور ترکستان میں اسلامی حکومت کے استحکام کا معاملہ ہے۔ میرے نزدیک اگر ان علاقوں میں درجِ ذیل کام اس طرح پر نہ کیے جاتے تو تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ان علاقوں کا حال بھی ہندوستان سے زیادہ مختلف نہ ہوتا:

(الف) وہاں پر امام اعظم امام ابوحنیفہؒ ——— جو کہ فارسی النسل تھے ——— جیسے لوگوں نے اس طرح کے مسائل حل کرنے کی طرف بھرپور توجہ دی۔

(ب) آپ نے فقہ اسلامی کی تہذیب و تدوین کرتے ہوئے، عقائد، اَخلاق اور اعمال کی جامعیت پر مبنی ''فقہِ اکبر'' ترتیب دی۔ اور اسے فارسی لوگوں کی ذہنیت کے مطابق بنا کر پیش کیا۔ مثلاً امام ابوحنیفہؒ نے عربی زبان پر قدرت کے باوجود، فارسی زبان میں ''قرآتِ صلوٰۃ'' کو جائز قرار دیا۔

(ج) اور پھر یہ بھی ہوا کہ علمائے عجم کی ایک بڑی جماعت، امام ابوحنیفہؒ کی رائے اور فقہ کو تمام بستیوں اور شہروں میں پھیلانے کے لیے سرگرمِ عمل ہوگئی۔

(د) امامِ ابوحنیفہؒ کے فلسفے اور فقہ کو پھیلانے کے لیے، صوفیائے کرام نے بھی ایسے علما کی اتباع کی۔

اگر درجِ بالا اُمور نہ ہوتے تو ان علاقوں میں بھی مسلمان اپنی سلطنت کا استحکام اپنے پسندیدہ طریقے پر نہ دیکھ سکتے۔ یہاں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ ایران اور ترکستان کا فلسفہ بھی وہی ہے، جو کہ ہندوستان کا فلسفہ رہا ہے۔

www.rahimia.org

امام ابوحنیفہؒ کی عظمت اور جامعیت

ہمیں اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ حکیم بھی تھے اور صوفی بھی تھے۔آپؒ کی صحبت اُٹھانے کے لیے صوفیا آپؒ کی طرف رجوع کرتے تھے۔اس لیے کہ حضرت معروف کرخیؒ نے حضرت داؤد طائی کی صحبت اختیار کی۔اور انھوں نے حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی صحبت اُٹھائی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ سیاسی اور انقلابی بھی تھے۔انھوں نے آئمہ اہل بیت، جیسے زید شہیدؒ، محمد الباقرؒ اور جعفر الصادقؒ سے بھی اخذِ فیض کیا تھا۔اور وہ محمد بن عبداللہ نفسِ زکیہ کے معاونین میں سے تھے۔نیز ان کے بھائی ابراہیم کی بھی انھوں نے پوری معاونت کی تھی۔واللہ سبحانہٗ أعلم

فصل (9): صوفیا کی جدوجہد اور حضرت ابوذر غفاریؓ کا مسلک

ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں صوفیا کے بلند درجہ کردار، ان کی اشاعتِ اسلام کے بارے میں جدوجہد اور جہاد کے حوالے سے اُن کے کردار کو بیان کرتے ہوئے ہم نے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے۔اس لیے کہ ہم ان کے قائم کردہ سیاسی نظام کے ایک حصے کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ہندوستان کے لوگ ایک تسلسل کے ساتھ تصوف سے لگاؤ رکھنے والے حضرات کی اس سیرت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ تصوف میں مشغول ہونے والا ہر آدمی، اپنی ضرورت سے زائد مال کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کو فرض سمجھتا ہے:

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے ''منهاج السنه'' میں لکھا ہے:

''بے شک حضرت ابوذر (غفاریؓ) ایک صالح آدمی، اور زہد اختیار کرنے والے فرد تھے۔اور ان کا مذہب یہ تھا کہ زہد (دنیا سے بے رغبتی) واجب ہے۔اور یہ کہ ایک انسان جب اپنی ضرورت سے زائد مال جمع کرکے رکھے تو یہ ''کنز'' (اکتناز یعنی زر کی ذخیرہ اندوزی) کے زُمرے میں آتا ہے۔اسے جہنم کی آگ میں گرم کرکے صاحبِ مال کو داغا جائے گا۔حضرت ابوذر (غفاریؓ) کی اس بات سے صوفیا کی ایک جماعت نے بھی اتفاق ظاہر کیا ہے۔جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عبدالواحد بن زیدؒ وغیرہ حضرات کی سوچ یہی تھی۔اور بعض لوگ حضرت شبلیؒ کو بھی انہی لوگوں میں شامل کرتے ہیں۔

حضرت ابوذر (غفاریؓ) لوگوں پر ایسی چیز واجب کرتے تھے، جو اللہ نے ان پر واجب نہیں کی، لیکن اس کے باوجود وہ ایک مجتہد تھے۔اور انھیں بھی اس نیکی پر ایسا ہی اجر ملے گا، جیسا کہ ان جیسے دیگر مجتہدین کو اجر ملتا ہے۔

حضرت عمر بن الخطابؓ اپنی رعایا کے تمام لوگوں کو بالکل سیدھا رکھتے تھے۔وہ لوگوں کو حد سے زیادہ تجاوز نہ کرنے دیتے تھے۔نہ مال داروں کو اور نہ فقرا کو۔لیکن جب حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے

www.rahimia.org

میں مال داروں پر دنیا وسیع ہونے لگی تو حضرت ابوذر (غفاریؓ) نے ان کے اس عمل پر اعتراض کرنے میں شدت اختیار کی۔ اور یہ بات بھی دونوں جماعتوں کے درمیان فتنوں کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔'' انتھیٰ (8)

فصل (10): ہمارے پروگرام کے بنیادی اُمور

اس مطالعے سے ہم نے یہ فائدہ اُٹھایا کہ ایک سروراجی (عوامی) قسم کی سیاسی انقلابی جماعت کی بنیاد رکھنے کے لیے جس اساسی مواد کی ضرورت ہے، وہ تاریخ اسلام میں کردار ادا کرنے والی جماعتوں اور حکومتوں کے افکار ونظریات اور ان کی سیرت وکردار میں مخفی طور پر موجود ہے۔

چناں چہ ہم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے فکر کی اساس پر ایک سروراجی (عوامی) جماعت کی بنیاد رکھی۔ اور ہم نے اپنے آئمہ صوفیا کی طرز پر اپنی جماعت کے اراکین پر لازم قرار دیا کہ وہ اپنی ضروریات سے زائد مال کو جماعت کے بیت المال میں جمع کرائیں۔

اس فیصلے کے لیے ہم اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استیناس (مناسبت پیش) کرتے ہیں: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (219:2) (اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دے کہ جو بچے اپنے خرچ سے) لیکن یہ حکم شرعی حوالے سے فرضیت کے طور پر نہیں ہے، بلکہ انقلابی مصلحت کی وجہ سے یہ حکم ہے۔ ہم نے حضرت ابوذر غفاریؓ اور ان کے متبعین علما ومشائخ کی بات کو اس طرح مانا ہے۔ اس کی مصلحت یہ ہے کہ ہم باقی فقہا و مجتہدین سے اختلاف کرنے کی حالت سے باہر نکل آئیں۔

اصل میں حضرت ابوذرؓ (غفاری) مال جمع کرنے پر شدت سے جو اعتراض کرتے تھے، اس کا تعلق حکمرانوں کے ساتھ تھا۔ اس لیے کہ وہ حکومت کو اسلامی پارٹی سے اپنے خاندان میں منتقل کرنے کے لیے مال کو ذریعہ بناتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانے میں، نیز حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں حضرت ابوذر غفاریؓ اس طرح شدت سے مال کے جمع کرنے پر انکار نہیں کرتے تھے۔

ہمارا اقتصادی نقطۂ نظر

ہمارا اپنا ارادہ تو یہ ہے کہ ہم اللہ کے فضل اور اس کی توفیق سے امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطابؓ کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ انھوں نے مال داروں اور فقرا کے درمیان اعتدال وتوازن قائم رکھا تھا۔ چناں چہ ہماری سروراجی حکومت مختلف پارٹیوں پر مشتمل حکومت ہوگی، جس میں اغنیا کی جماعت بھی ہوگی۔ اور فقرا کی جماعت بھی مساوی طور پر شامل ہوگی۔ اسی لیے ہم درمیانے درجے پر اشیا کی ملکیت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور مال داروں کو تعیّشات کے درجے پر پہنچانے والی مال داری سے روکتے ہیں۔

www.rahimia.org

ہم نے یہ بھی طے کیا ہے کہ ملکیت کے درمیانے درجے کا تعین کرنا ایسے اہل حل وعقد کی رائے پر موقوف ہوگا، جو اِن (حضرت عمرؓ کی فقہ پر مبنی) دینی نظریات پر پختہ یقین رکھتے ہوں گے۔ سروراجی مؤتمر کے پروگرام سے ہماری یہی مراد ہے۔ واللہ الموافق

باب (9) مسجدِ حرام میں تدریس

فصل (1): مکہ مکرمہ میں زیرِ درس کتابیں اور عرب علما کی حالت

ایک زمانے تک میں مسجد حرام میں تعلیم وتدریس میں مشغول رہا۔ چناں چہ علما اور طلبا نے مجھ سے امام مالکؒ کی "مؤطا"۔ امام محمدؒ کی "مؤطا" اور "كتاب الآثار"۔ امام شافعیؒ کی "كتاب الرساله"، اور "كتاب الاُم"۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تین کتابیں: "المسوى من أحاديث المؤطا"، "الفوز الكبير فى أصول التفسير"، اور "حجة الله البالغه"۔ امام محمد اسماعیل شہیدؒ کی "اصولِ فقه"۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی "شرح النُخبه" اور اصولِ حدیث سے متعلقہ کتابیں، "مقدمه صحيح مسلم"، "كتاب العلل من جامع الترمذى" اور "رساله إمام أبى داؤد إلى أهل مكه" پڑھیں۔

اور حرم سے باہر بھی علما اور طلبا نے مجھ سے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابیں "حجة الله البالغه" اور "إزالة الخفا" کے اطراف، رسالہ "مذهب عمر بن خطاب"، "الفوز الكبير"، "فتح الرحمن" کے اطراف، "فيوض الحرمين" وغیرہ پڑھیں۔ اسی طرح امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے رسائل اور شیخ رفیع الدین کی "تكميل الأذهان" کے اطراف (یعنی کتاب کے اول وآخر اور منتخب کچھ اَجزا)۔ اور امام محمد اسماعیل شہیدؒ کی تاریخی کتابیں "صراطِ مستقيم"، "منصب إمامت"، "عبقات"، "أصولِ فقه" اور "تقوية الإيمان"۔ اور امام محمد قاسم دیوبندیؒ کے مکتوبات "قاسم العلوم" وغیرہ کتابیں مجھ سے پڑھیں۔

مَیں نے (مکہ مکرمہ میں) یہ بات دیکھی کہ علم میں مشغول رہنے والے لوگ عام طور پر ہندوستان کے علما کو نہیں جانتے۔ وہ لوگ اہل حدیث کی ایک جماعت ——— جو فقہائے اربعہ کے مذاہب کی پابندی اختیار نہیں کرتے ——— کے سوا ہندوستان کے حنفی علما سے آگاہ ہی نہیں رکھتے۔ اور ان کے بارے میں مشہور کر رکھا ہے کہ وہ اپنی قیاس پر مبنی آرا کو صحیح احادیث پر مقدم سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ محدثین حنفیہ میں سے بھی سوائے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور ان کے متبعین کے اور کسی کو نہیں جانتے ہیں۔ وہ لوگ اس کو پسند نہیں کرتے کہ فقہا آئمۂ محدثین کی احادیث کے بارے میں فقہا کے ترجیح دیئے ہوئے مذاہب سے استدلال کریں۔ اور پھر فقہا کے مستدلات پر مبنی احادیث کو صحیح

www.rahimia.org

قرار دینے کے لیے ہر طرح کے رطب و یابس سے اپنے دامن کو بھرلیں۔

اس حقیقت کے معلوم ہونے پر میں نے ان کے سامنے امام ولی اللہ دہلویؒ حنفی اور ان کے دہلوی اور دیوبندی متبعین کے طریقے کا تذکرہ کیا۔ اور یہ واضح کیا کہ ان کا طریقۂ تعلیمِ حدیث یہ ہے کہ وہ مؤطا امام مالک کو تمام کتبِ حدیث وفقہ پر ترجیح دیتے ہیں۔

فصل (2): ولی اللّٰہی طرزِ تعلیم میں "مؤطا" کی اہمیت

امام ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب "المُصفّٰی" میں یہ بات بڑی صراحت کے ساتھ لکھی ہے کہ فقہ میں تحقیق کے درجے تک اس وقت تک نہیں پہنچا جاسکتا، جب تک کہ مؤطا امام مالک کو تحقیق کے ساتھ نہ پڑھ لیا جائے۔ چناں چہ حضرت شاہ صاحبؒ نے "المسوّٰی" میں لکھا ہے:

"جس آدمی نے فقہا کے مذاہب کی تحقیق کی ہے۔ اور اللہ نے جس کے دل میں انصاف کی صلاحیت رکھی ہے تو وہ قطعی طور پر یہ بات جان لے گا کہ کتاب "مؤطا" امام مالکؒ کے مذہب کی اساس اور اس کا بہترین اثاثہ ہے۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے مذہب کا سر اور اس کا عمدہ ستون ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ کے مذہب کا روشن چراغ اور اس کی بلند ہوتی روشنی ہے۔ اور یہ تمام مذاہب "مؤطا" کے حوالے سے ایسے ہی ہیں، جیسے کسی ایک متن کی مختلف شرحیں ہوتی ہیں۔ اور اس کتاب کی حیثیت ان مذاہب کے درمیان میں ایسی ہے، جیسا کہ مختلف ٹہنیوں کو لیے ہوئے ایک بڑا درخت ہوتا ہے۔

(بڑے بڑے فقہا اور مجتہد) لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگرچہ وہ امام مالکؒ کے فتاویٰ کو ماننے اور ردّ کرنے، اور ان کو درست تسلیم کرنے، اور ان پر اعتراض کرنے میں مشغول رہے ہیں، لیکن ان کے اپنے مذہب کی تہذیب و تدوین اور ان کے اپنے مذہب و مسلک کی صفائی اس وقت تک ممکن نہیں ہو پائی، جب تک کہ انھوں نے اپنے سامنے امام مالکؒ کی اس جدوجہد اور کوشش کو سامنے نہیں رکھا، جو انھوں نے (مؤطا کی ترتیب و تدوین کی شکل میں) اپنے مذہب کو ترتیب دینے کے لیے کی تھی۔ اسی لیے امام شافعیؒ نے لکھا: "مجھ پر اللہ کے دین میں امام مالکؒ سے زیادہ احسان کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔" (9)

اور یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ احادیث کی سنن پر مشتمل کتابیں، جیسا کہ "صحیح مسلم"، "سنن ابی داؤد"، "سنن نسائی" اور فقہ سے متعلق حدیث کی کتابیں، جیسا کہ "صحیح بخاری"، "جامع ترمذی" ہیں، یہ تمام کتابیں "مؤطا امام مالکؒ" کی اساس پر مستخرج شدہ ہیں۔ وہ اسی کے گرد گھومتی ہیں۔ اور انھیں مقاصد کو اپنا مقصد قرار دیتی ہیں۔ ان کا مطمحِ نظر یہ ہے کہ جن احادیث کو امام مالکؒ مرسل لاتے ہیں، انھوں نے اسے متصل بیان کر دیا۔ اور جو احادیث "مؤطا" میں

www.rahimia.org

موقوف ہیں، انھوں نے اسے مرفوع بیان کردیا۔ اور جنھیں امام مالکؒ نے چھوڑ دیا تھا، اس کا انھوں نے استدراک کردیا۔ نیز انھوں نے ان کی بیان کردہ اسانید کے متابعات اور شواہد بیان کردیے۔ اور متعلقہ باب کے کلام کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرلیا۔ خاص طور پر اس باب میں اس کے خلاف جو کچھ روایات موجود تھیں، انھیں بھی بیان کردیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق کی تحقیق اس وقت تک ممکن نہیں، نہ یہاں (محدثین) نہ وہاں (فقہا)، جب تک کہ اس کتاب "مؤطا" پر پورے انہاک کے ساتھ توجہ نہ کی جائے۔'' اِنتھیٰ (10)

(نواب صدیق حسن خان بھوپالی) امیر قنوجی نے "حطه" میں لکھا ہے:

''شیخ عبدالعزیز دہلویؒ اور ان کے والد شیخ الاجل ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "مؤطا" پر بہت زیادہ توجہ دی ہے۔ ان کے نزدیک اس کی بڑی عظمت ہے۔ یہ حضرات اس پر عمل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس کو تمام کتبِ حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ صحیحین (صحیح بخاری اور صحیح مسلم) پر بھی اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ چہ جائے کہ دوسری حدیث کی کتابوں کو اس کے مقابلے پر شمار کیا جائے۔ اور حق بات انہی کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔'' (11)

انھوں نے "حطه" ہی میں دوسری جگہ لکھا ہے:

''محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ کی کتاب (قرآن حکیم) کے بعد سب سے صحیح ترین کتاب، صحیح البخاری، پھر صحیح مسلم اور پھر مؤطا ہے۔ بعض کے نزدیک سب سے صحیح ترین کتاب "مؤطا" ہے۔ پھر صحیحین (یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم) ہیں۔ اور یہی بات زیادہ صحیح ہے۔'' اِنتھیٰ (12)

امیر قنوجی نے "أبجد العلوم" میں لکھا ہے کہ:

''محققین کے نزدیک امام مالکؒ کی کتاب "مؤطا" حدیث کی کتابوں کے طبقۂ اولیٰ میں شامل ہے۔ اور اس کے شارح "المصفّی" اور "المسوّی" کے مصنف (امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ) اس بات کو بڑے شد و مد سے بیان کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ انھوں نے یہاں تک کہا ہے کہ اس دور میں بنیادی مقصد تب حاصل ہوگا، جب کہ "مؤطا" پر عمل کیا جائے۔ اور "مؤطا" کو نظر انداز کرکے باقی کتب اور تفریعات (جزوی مسائل) پر عمل کرنا چھوڑ دیا جائے۔'' انتھیٰ (13)

حضرت مولانا أبو الحسنات عبدالحئی لکھنویؒ "شرح مؤطا" میں لکھتے ہیں:

''شیخ ولی اللہ محدث حنفی دہلویؒ نے بہت زیادہ کتابیں لکھی ہیں، جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آپؒ بڑی جلیل القدر شان رکھتے تھے۔ اور کبار علما میں سے تھے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپؒ کو رُشد و ہدایت اور عدل وانصاف کی توفیق دی تھی۔ آپؒ ہر طرح کے تعصب اور تنگ نظری سے پرہیز کرتے

www.rahimia.org

تھے۔ علومِ دینیہ میں آپؒ کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ احادیثِ نبویہ کی مباحث میں آپؒ ایک متبحر عالم دین کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے ''مؤطا'' کی دو شرحیں لکھیں۔ ایک فارسی زبان میں، جس کا نام انھوں نے ''المصفّٰی'' رکھا۔ اس کتاب میں صرف احادیث اور آثار کو بغیر کسی شرح کے جمع کیا ہے۔ اور امام مالکؒ کے بعض اقوال کو حذف کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجتہدین کے انداز میں محققانہ گفتگو کی ہے۔ اور دوسری شرح عربی زبان میں لکھی، جس کا نام انھوں نے ''المسوّٰی'' رکھا۔ اس میں انھوں نے مذاہب کے اختلاف کو بیان کرنے پر اکتفا کیا۔ اور بہت کم مقدار میں غریب احادیث کی ضروری شرح بیان کی۔'' اِنتھیٰ (14)

میرا کہنا یہ ہے کہ ''مؤطا'' امام مالکؒ کو تمام کتب حدیث پر مقدم کرنے سے ولی اللّٰہی طریقۂ حدیث عام فقہا اور محدثین سے جوہری طور پر مختلف ہو جاتا ہے۔ اور جو آدمی اس حقیقت کو نہیں سمجھتا، اُس کے لیے یہ درست نہیں کہ وہ اپنے آپ کو امام ولی اللہ دہلویؒ کے متبعین میں سے شمار کرے۔

فصل (3): امام ولی اللہ دہلویؒ کا طریقۂ تعلیم و تربیت

امام ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی ''وصایا'' میں لکھا ہے:

''تعلیم کا طریقہ یہ ہے کہ جب بچے کو عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے تو اُسے ''مؤطا'' امام مالکؒ ـــــ جو کہ یحییٰ ابن یحییٰ مصمودیؒ کی روایت سے ہے ـــــ پڑھائی جائے۔ اور ہرگز اس کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ وہ علمِ حدیث کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اور اس کا پڑھنا بہت زیادہ فیض یاب ہونے کا باعث ہے۔ اور ہم کو اس کتاب کا مکمل سماع پورے تسلسل کے ساتھ حاصل ہے۔

اس کے بعد قرآن عظیم کا درس اس بچے کو اس طرح دیا جائے کہ بغیر تفسیر اور ترجمے کے اُسے قرآن پڑھایا جائے۔ اور جو کچھ نحو میں یا شانِ نزول میں مشکل پیش آئے، اُس پر ٹھہرا جائے۔ اور اس پر بحث کی جائے۔ اس طرح درسِ تفسیر سے فارغ ہو کر تفسیر ''جلالین'' کا درس، روزانہ کی مقدار کے مطابق دیا جائے۔ اس طریقے میں بہت زیادہ فیض حاصل ہوتا ہے۔'' اِنتھیٰ (15)

شاہ ولی اللہؒ سے پہلے کا طریقۂ تعلیم

میں کہتا ہوں کہ امام ولی اللہ دہلویؒ سے پہلے ہندوستان کے علما سب سے پہلے (علمِ حدیث میں) ''مشکوٰۃ المصابیح'' پڑھتے تھے۔ اور اس کی شرح کے سلسلے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مشکوٰۃ کی شرح ''لمعات التنقیح لمشکوۃ المصابیح'' اور ''اشعۃ اللمعات'' کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان دونوں شروحات میں پہلی عربی میں ہے۔ جب کہ دوسری شرح فارسی زبان میں ہے۔

شاہ صاحبؒ کا طریقۂ تعلیم اور اس کے فوائد

امام مجدد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس طریقے کی اصلاح کی۔ اور انھوں نے ''موطا'' کے درس کو ''مشکوۃ المصابیح'' سے پہلے پڑھنے کا طریقہ اختیار کیا۔ اور قرآن عظیم کے درس کو تفاسیر سے الگ کر کے پڑھنا ضروری قرار دیا۔ جیسا کہ باقی علوم میں ''شروح'' کے پڑھنے سے پہلے کتابوں کے ''متون'' پڑھے جاتے ہیں۔

جب طالب علم امام ولی اللہ دہلویؒ کے طریقے پر تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہوگا تو اُس کے دل و دماغ میں سب سے پہلے قرآن عظیم اور ''مؤطا امام مالکؒ'' تمام چیزوں پر مقدم ہو کر راسخ ہو جائے گی۔

کتبِ حدیث کے طبقات کے تعین میں اختلاف

''مؤطا امام مالکؒ'' یا ''صحیح بخاری'' کو مقدم کرنے کے حوالے سے ہونے والے اختلاف ہی کا ذیلی نتیجہ یہ ہے کہ کتبِ حدیث کی تصحیح میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔

عام علما — جو کہ ''بخاری'' کو مقدم سمجھتے ہیں — کے نزدیک کتبِ حدیث کے طبقۂ اولیٰ میں دو کتابیں صحیحین (بخاری، مسلم) ہیں۔ اور طبقۂ ثانیہ میں وہ کتابیں ہیں، جو شیخین (بخاریؒ، مسلمؒ) کی شرط پر ہیں۔ (جیسا کہ ''صحیح ابن خزیمۃؒ''، ''صحیح إبن حبانؒ'' اور ''مستدرک علی الصحیحین'') اور طبقۂ ثالثہ میں کتبِ سنن ہیں، جیسا کہ ''سنن ابی داؤد''، ''سنن نسائی''، ''سنن ترمذی'' وغیرہ۔

پس ان کے نزدیک جب امام حاکم اس بات کی تصریح کریں کہ یہ حدیث ''شیخینؒ'' کی شرط پر پورا اُترتی ہے تو وہ حدیث ابوداؤد کی روایت کی ہوئی حدیث پر مقدم سمجھی جاتی ہے۔ جب کہ امام ابوداؤد اس حدیث کے بارے میں خاموش رہے ہوں۔ اور ایسے ہی وہ کتابیں، جو علم حدیث میں اجنبی سمجھی جاتی ہیں، جیسا کہ ''صحیح ابن خزیمہؒ''، ''صحیح ابن حبانؒ'' اور ''منتقی لابن الجارودؒ'' وغیرہ کتابوں کے نسخے میں اگر کوئی حدیث پائی جائے تو اُسے ابوداؤد کی کتاب میں موجود حدیث پر ترجیح دی جاتی ہے۔

یہ لوگ احادیث کی تصحیح میں اُس کے رجال کے ثقہ اور بااعتماد ہونے پر اکتفا کرتے ہیں۔ صحیح روایات میں ان کے نزدیک مسلمانوں کے عمل اور ان کے نظر و فکر کی کوئی قیمت نہیں۔

اہل علم کی اس قسم کو ہم اُن لوگوں میں شمار کرتے ہیں، جنھیں شیخ ابوطاہر کردیؒ المدنی نے ''ورّاقیہ'' (ورق گردانی کرنے والوں کا گروہ) قرار دیا ہے۔ امام شوکانیؒ نے لکھا ہے کہ:

> ''جب مشہور آئمہ میں سے کوئی امام کسی راوی کے بارے میں ''حفظ''، ''عدالت''، ''حسن المعرفۃ والضبط'' جیسے جملے استعمال کرے۔ اور وہ اپنی کتاب میں صرف ان لوگوں کی روایت لائے، جو صحیح ہیں۔ اور اسے اس شان میں پوری مہارت حاصل ہو، جیسا کہ صحیحین (بخاری اور مسلم) کے

مصنفین۔ اور ''صحیح ابن حبانؒ'' اور ''صحیح ابن خزیمۃؒ'' وغیرہ۔ ان کی یہ تصحیح اس پر عمل کی گنجائش پیدا کرتی ہے۔ جب کہ وہ حدیث ان کتابوں میں پائی جائے۔'' اِنتھیٰ (16)

میں یہ کہتا ہوں کہ عام متأخرین علما بھی اسی طرح کی رائے رکھتے ہیں۔ مثلاً شیخ جلال الدین سیوطیؒ اور ان کے متبعینؒ، شیخ علی متقیؒ اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ وغیرہ، بلکہ شیخ عبدالحق تو ان طبقاتِ کتبِ حدیث کی ترتیب کی بھی بات نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک تو وہ حدیث، خواہ کسی اجنبی کتاب میں ہی کیوں نہ آئی ہو، لیکن اگر اس کی سند میں ایسے رجال موجود ہیں، کہ جن سے شیخینؒ (بخاریؒ، مسلمؒ) نے روایت کیا ہے تو وہ اس روایت کو شیخینؒ کے برابر قرار دیتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات اُس کو اُن پر ترجیح بھی دے دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ شیخ کمال الدین ابن ہمامؒ ——— جو متأخرین میں سے مجتہد ہیں ——— کی رائے کی اتباع کرتے ہیں۔ شیخ ابن ہمامؒ اگرچہ بڑی جلالتِ شان رکھتے ہیں، لیکن اس باب میں انھوں نے غلطی کی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علاوہ ہر آدمی کی بات کو قبول یا ردّ کیا جاسکتا ہے۔

''مؤطا'' کو تمام کتب پر ترجیح دینے والے محققین علما

وہ لوگ، جو ''مؤطا'' کو تمام کتبِ حدیث پر مقدم مانتے ہیں، ان میں قاضی عیاضؒ، امام ابن الاثیرؒ، ابوبکر ابن العربی المالکیؒ، حافظ مغلطائی حنفیؒ ہیں۔ لیکن ہم نے ان تمام کے کلام میں وہ مہارت نہیں دیکھی، جس کا اظہار امام ولی اللہ دہلویؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے ''باب طبقات کتب الحدیث'' میں کیا ہے۔

پھر اس کی پوری شرح امام عبدالعزیز دہلویؒ نے ''عجالۂ نافعہ'' میں کی ہے۔ اور پھر اس طبقاتِ کتبِ حدیث کے بنیادی پہلوؤں کو امام محمد قاسم دیوبندیؒ نے ''ھدیۃ الشیعہ'' (17) میں عقلی دلائل سے مضبوط کیا ہے۔

اس طرح اصحابِ نظر و فکر اگر ان تحقیقی آرا کی طرف تھوڑی سی بھی توجہ کریں تو ان کے سامنے شیخ ابن ہمامؒ کی رائے کی کمزوری واضح ہوجائے گی۔ اور یہ بات بھی ظاہر ہوجائے گی کہ محدثین میں سے ''ورّاقیہ'' (ورق گردانی کرنے والوں) کی حیثیت ایسی ہی ہے، جیسے فلاسفہ اور حکما میں ''سوفسطائیہ'' کی حیثیت ہے۔

فصل (4): ''مؤطا'' کے قائم کردہ اصول

میں نے اُن (علمائے عرب) کے سامنے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے حوالے سے اُن اصولوں کی وضاحت کی، جن پر ''مؤطا'' کی بنیاد ہے۔ یہاں میں اُن اصولوں کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔ انشاء اللہ اس کی پوری تفصیل حکیم الہند امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مذہب کے باب میں عن قریب بیان کی جائے گی۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

''جاننا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانے میں علمِ فقہ مدوّن شدہ نہیں تھا۔ اور نہ

www.rahimia.org

اُس زمانے میں احکاماتِ شرعیہ کے بارے میں اُس طرح کی بحث نہیں ہوتی تھی، جیسا کہ آج کل یہ فقہائے کرام بحث کرتے ہیں۔ .....

زمانۂ نبوی میں لوگ آپؐ کے اعمال کی نقل کرتے ہیں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں معاملہ یہ تھا کہ آپؐ نے وضو فرمایا۔ صحابہؓ نے آپؐ کو وضو کرتے دیکھا۔ اور انھوں نے اس پر عمل کرنا شروع کردیا۔ اس بات کو دیکھے بغیر کہ یہ شریعت کا رُکن ہے یا ادب (مستحب) ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تو لوگ آپؐ کی نماز کی طرح نماز پڑھنے لگے۔ آپؐ نے حج کیا تو لوگ آپؐ کے حج میں کیے ہوئے افعال کی طرح مناسکِ حج ادا کرنے لگے۔ چناں چہ آپؐ کا عام حال یہی تھا۔ اور آپؐ نے کبھی یہ نہیں بیان فرمایا کہ وضو کے فرض چھ ہیں یا چار.....

صحابہؓ نے جو کچھ دیکھا اور سنا، اُسے روایت کیا

پس ہر صحابیؓ نے —— جو کچھ اللہ نے انھیں آسانی دی —— آپؐ کی عبادت کو دیکھا۔ آپؐ کے فتاویٰ اور فیصلوں کو مشاہدہ کیا۔ اور اُسے محفوظ کرلیا۔ اور یاد کرلیا۔ اور ہر چیز کو قرائن کی مناسبت سے اچھی طرح سمجھا۔ پس انھوں نے آپؐ کے بعض اعمال کو اباحت (جواز) پر محمول کیا۔ اور بعض کو نسخ (منسوخ ہونے) پر، اُن علامات اور قرائن کی وجہ سے، جو اُن کے نزدیک کافی تھے۔

اُن کے نزدیک سب سے بہترین اور عمدہ بات، استدلال کے عقلی طریقوں کی طرف توجہ دیے بغیر، وجدانی طور پر دلی اعتماد اور اطمینان کا حصول تھا۔ جیسا کہ آپ عام طور پر دیہاتیوں کے بارے میں جانتے ہیں کہ وہ آپس میں بات کے اصل مقصد کو سمجھ جاتے ہیں۔ اور انھیں بات کے سمجھنے میں دلی اطمینان حاصل ہوجاتا ہے۔ خواہ وہ گفتگو صراحتاً کی جائے یا اشارتاً اور کنایتاً کی جائے۔ اور اگرچہ گفتگو کے صراحت، اشارے اور کنائے کے قوانین کا شعور نہ بھی رکھیں۔

اس طرح آپؐ کا زمانہ ختم ہوا۔ اور لوگ اسی حالت کے مطابق عمل کرتے رہے۔

صحابہ کرامؓ کا اطرافِ مملکتِ اسلامیہ میں پھیلنا

اس کے بعد صحابہؓ مختلف شہروں میں پھیل گئے۔ اور مملکتِ اسلامیہ کے اطراف میں اُن میں سے ہر ایک مقتدا اور رہنما بن گیا۔ اب نئے نئے واقعات کثرت سے پیدا ہونے لگے۔ اور نئے پیدا شدہ مسائل کے بارے میں ان کے درمیان گفتگو شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں اُن سے سوالات کیے گئے۔ ہر ایک نے آپؐ کی محفوظ باتوں کے تناظر میں جوابات دیے۔ یا انھوں نے خود ایسی باتوں کا استنباط کیا، جن سے جواب دیا جاسکتا ہے۔ اور اپنی رائے اور اجتہاد سے کام لیا۔ اور اُس علت کو پہچانا، جو اُن کے خیال

www.rahimia.org

میں نبی اکرمؐ کے منصوص حکم کی بنیاد تھی۔ انھوں نے کوئی کوتاہی کیے بغیر ایسے احکامات بیان کیے، جن کا مقصد حضورؐ کے منشائے مبارک کی موافقت تھی۔

صحابہ کرامؓ کے درمیان مسائل کے بیان میں اختلاف

اس دور میں صحابہؓ کے درمیان درجِ ذیل چند وجوہات کی وجہ سے مسائل کے بیان میں اختلاف پیدا ہوا:

(الف) حکم کے نقل کرنے اور اجتہاد کے حوالے سے اختلاف

اختلاف کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ایک صحابیؓ نے کسی واقعے یا فتوے کے ضمن میں آپؐ کا قول سنا تھا۔ اور انھوں نے اُس کے مطابق فتویٰ دیا تھا۔ جب کہ دوسرے صحابیؓ نے آپؐ کی وہ بات نہیں سنی تھی۔ اور انھوں نے اپنی رائے سے اس سلسلے میں اجتہاد کیا ..... (اس کی بھی ذیلی چار وجوہات ہیں، جنھیں شاہ صاحبؒ نے بیان کیا ہے۔ آزاد)

(ب) حکم کی نوعیت سمجھنے میں اختلاف

صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حج کرتے ہوئے دیکھا۔ اب بعض حضرات نے سمجھا کہ آپؐ نے ''حج تمتُّع'' کیا ہے۔ بعض نے یہ سمجھا کہ آپؐ نے ''حج قِران'' کیا ہے۔ جب کہ تیسری جماعت نے یہ سمجھا کہ آپؐ نے ''حجِ اِفراد'' کیا ہے۔

(ج) حکم سمجھنے میں غلط فہمی پر مبنی اختلاف

اختلاف کا ایک سبب سہو و نسیان بھی بنا..... (مثلاً حضرت عبداللہؓ ابن عمرؓ نے روایت کیا کہ حضورؐ نے رجب کے مہینے میں عمرہ کیا تھا، جب کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ انھیں غلطی لگی ہے۔)

(د) حکم کی علت دریافت کرنے میں اختلاف

اختلاف کا ایک سبب حکم کی علت تلاش کرنے میں اُن کے درمیان اختلاف پایا گیا۔........

(ہ) مختلف احکامات کے جمع کرنے کے بارے میں اختلاف

اختلاف کا ایک سبب دو مختلف احکامات میں جمع کرنے کے بارے میں صحابہ کرامؓ میں اختلاف پایا گیا۔

خلاصہ یہ کہ اس طرح نبی اکرمؐ کے صحابہؓ کی آرا باہم مختلف ہوگئیں۔

پھر تابعین میں سے جس کو جس صحابی سے تعلیم حاصل کرنے کی سہولت میسر آئی، اُس نے اُن سے تعلیم حاصل کی۔ صحابہ کے باہمی اختلاف کی وجہ سے تابعین کے درمیان بھی اسی طرح اختلافات پیدا ہوئے۔ اُن میں سے بعض نے حضورؐ کی احادیث سنیں اور یاد رکھیں۔ صحابہؓ کی آرا کو سمجھا۔ اور مختلف باتوں کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ بعض حضرات کے اقوال کو بعض پر ترجیح دی۔ اس طرح تابعینؒ کی نظر میں

www.rahimia.org

بعض اقوال کمزور محسوس ہوئے۔ اور انھوں نے انھیں ترک کردیا، اگرچہ وہ کبار صحابہؓ سے منقول شدہ تھے۔اس طرح تابعینؒ میں سے ہر ایک کا تمام فقہی ابواب کے حوالے سے ایک مذہب بن گیا۔

تابعین کے مذاہب اوران کی امامت

اس طرح مملکتِ اسلامیہ کے اہم شہروں میں تابعین میں سے کچھ حضرات امامت کے منصب پر فائز ہوگئے۔ جیسے مدینہ منورہ میں حضرت سعید بن مسیّبؒ، حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؓاور پھران کے بعد امام زُہریؒ، قاضی یحیٰی بن سعیدؒ، ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰنؒ۔ اور مکہ مکرمہ میں حضرت عطا بن ابی رباحؒ۔کوفہ میں حضرت ابراہیم نخعیؒ اور امامِ شعبیؒ۔ بصرہ میں حضرت حسن بصریؒ۔یمن میں حضرت طاؤس بن کیسانؒ۔ اورشام میں حضرت مکحولؒ۔

پس لوگ علوم حاصل کرنے کے لے دور دراز سے ان کے پاس آنے لگے۔لوگوں نے ان سے حدیث پڑھی۔صحابہؓ کے فتاویٰ اور اُن کے اقوال اَخذ کیے۔ اور ان حضرات کے مذاہب اور ان کی تحقیقات پڑھیں۔سوال کرنے والوں نے اُن سے سوالات کیے۔اس طرح اُن کے درمیان نئے پیدا ہونے والے مسائل زیرِبحث رہے۔اور فیصلوں کے لیے اُن کی طرف رجوع کیا جانے لگا۔اس طرح حضرت سعید بن مسیّبؒ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ جیسے لوگوں نے فقہ کے تمام ابواب میں جمع وتدوین کا کام کیا۔اورانھوں نے ہر باب کے ایسے اصول متعین کیے، جو انھوں نے سلف سے حاصل کیے تھے۔

حضرت سعید بن مسیّب اور فقہائے حرمین (مکہ، مدینہ)

حضرت سعید بن مسیّبؒ اوران کے ساتھی، فقہ کے سلسلے میں حرمین شریفین کے صحابہ وتابعین پرزیادہ اعتماد کرتے ہیں۔ان کے مذہب کی بنیاد حضرت عبداللہ بن عمرؓ،حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے فتاویٰ ہیں۔اور مدینے کے قاضیوں کے فیصلے ہیں۔انھوں نے ان تمام کوجمع کرلیا، جتنی اللہ نے اُن کے لیے آسانی پیدا کی تھی۔ پھرانھوں نے اس پرفنِ اعتبار کے نقطۂ نظر سے توجہ کی۔اور تحقیق وتفتیش کی۔ اس کے نتیجے میں:

1۔ علمائے مدینہ کے نزدیک، جو متفق علیہ اور اجماعی مسائل تھے، ان کو انھوں نے مضبوطی سے پکڑلیا۔

2۔ جن مسائل میں علمائے مدینہ کا اختلاف پایا جاتا تھا، ان میں سے انھوں نے زیادہ راجح اور مضبوط قول کو لے لیا۔اور ترجیح کی وجوہات درجِ ذیل تھیں:

(الف) ایک یہ کہ وہ قول، علمائے مدینہ کی اکثریت کا تھا۔

(ب) یااس لیے کہ وہ قول، قیاسِ قوی سے موافقت رکھتا تھا۔

www.rahimia.org

(ج) یا یہ کہ اُس قول کی تخریج، کتاب وسنت کی صریح نص سے ہوئی تھی۔

(د) یا اس کے علاوہ کوئی اور وجہ۔

(3) اور اگر کسی مسئلے کا جواب علمائے مدینہ کے محفوظ ذخیرے میں نہ پاتے تو اُن کے دائرے سے نکل کر احادیث کے الفاظ پر مبنی اشارات اور اُن کے تقاضوں کی اتباع کرتے۔

اس طرح فقہ کے ہر ہر باب میں انھوں نے بہت سے مسائل مرتب اور مدوّن کردیے۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ اور فقہائے کوفہ

جب کہ حضرت ابراہیم نخعیؒ اور ان کے شاگردوں نے یہ دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ —— (جنھیں حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ کی تعلیم وتربیت کے لیے مقرر کیا تھا) —— اور ان کے تربیت یافتہ شاگرد، فقہ میں زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ جیسا کہ حضرت علقمہؒ نے حضرت مسروقؒ سے کہا تھا کہ: ''کیا علمائے مدینہ میں کوئی آدمی عبداللہ بن مسعودؓ سے زیادہ ثقہ اور قابل اعتماد ہے؟'' اسی طرح امامِ اعظم امام ابوحنیفہؒ نے ایک دفعہ امام اوزاعیؒ سے کہا تھا کہ: ''ابراہیم نخعیؒ، سالمؒ سے زیادہ فقیہ ہیں۔ اور اگر صحبتِ نبویؐ کی فضیلت حاصل نہ ہوتی تو میں یہ کہتا کہ حضرت علقمہؒ، عبداللہ بن عمرؓ سے زیادہ فقیہ ہیں۔ اور عبداللہ (بن مسعودؓ) تو عبداللہ ہیں (یعنی اُن کا کیا مقابلہ)۔''

حضرت ابراہیم نخعیؒ کے مذہب کی بنیاد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے فتاویٰ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عدالتی فیصلے اور حضرت قاضی شریحؒ اور دیگر کوفہ کے قاضیوں کے فتاویٰ اور عدالتی فیصلے ہیں۔ پس انھوں نے ان تمام کو جمع کیا۔ جتنی اللہ نے ان کو توفیق دی۔ پھر انھوں نے بھی ان (کوفہ اور بصرہ سے) جمع شدہ آثار وروایات سے مسائل اخذ کرنے کا وہی طریقۂ کار اختیار کیا، جو اہل مدینہ نے اہل مدینہ کے آثار و روایات کے ساتھ کیا۔ اور اس طرح انھوں نے بھی بہت سے مسائل کی تخریج کی۔ اور فقہ کے ہر ہر باب میں بہت سے قوانین اور احکامات کی تلخیص کردی۔

حضرت سعید بن مسیّب اور حضرت ابراہیم نخعی کا مقام

حضرت سعید بن مسیّبؒ، فقہائے مدینہ کی زبان ہیں۔ اور وہ حضرت عمرؓ کے فیصلوں اور حضرت ابوہریرہؓ کی حدیثوں کے سب سے بڑے حافظ ہیں۔ جب کہ حضرت ابراہیم نخعیؒ فقہائے کوفہ کی زبان ہیں۔ یہ دونوں حضرات جب بھی کچھ بولتے ہیں۔ اور اس کی کسی کی طرف نسبت نہ بھی کریں تو ان کی کہی ہوئی اکثر باتیں ان کے سلف میں سے کسی نہ کسی ایک کی طرف صراحتاً یا اشارتاً منسوب ہوتی ہیں۔ پس ان دونوں حضرات پر ان کے شہروں (مدینہ اور کوفہ) کے فقہا کا اجتماع ہو چکا ہے۔ لوگوں نے ان دونوں

www.rahimia.org

سے تعلیم حاصل کی۔ ان کی باتوں کو سمجھا۔ اور ان کی بنیاد پر مسائل کی تخریج کی۔ واللہ اعلم

تابعین کے بعد کے اہلِ علم و فقہ

جاننا چاہیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا تھا، کہ:

"یحمل ھذا العلم من کل خلف عدولہ." (18) (عدل و انصاف کے حامل اس علم کو اُٹھانے والے ہر ایک دور میں پیدا ہوتے رہیں گے)

اس کے مطابق تابعین کے زمانے کے بعد علم کے حاملین کا ایک نیا زمانہ سامنے آیا۔

چناں چہ اس زمانے کے علما نے اپنے سے پہلے علما کے متفقہ اجماعی مسائل کی تعلیم حاصل کی۔ جیسے مثلاً وضو، غسل، نماز، حج، نکاح، خرید و فروخت وغیرہ کے طریقے ہیں۔ اور وہ مسائل، جو بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے نبی اکرمؐ کی احادیث کی روایت کی۔ اپنے اپنے شہروں کے قاضیوں کے فیصلے سنے۔ ان شہروں کے مفتیوں کے فتاویٰ سمجھے۔ اُن سے مسائل دینیہ کے بارے میں سوالات کیے۔ اور اس سلسلے میں بڑی جدوجہد اور کوشش کی۔ اس طرح وہ قوم کے رہنما بن گئے۔ اور یوں اگلے دور میں دین کا معاملہ ان کے سپرد ہوگیا۔

تبع تابعین کے طریقۂ کار کا خلاصہ

یہ لوگ بھی اپنے اپنے مشائخ کے طریقۂ کار پر چلے۔ اور انھوں نے بھی احادیث کے الفاظ پر مبنی اشارات اور اُن کے تقاضوں کی اتباع کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ چناں چہ خود انھوں نے بھی عدالتی فیصلے کیے۔ فتوے جاری کیے۔ مسائل کی روایت کی۔ اور اس کی تعلیم و تربیت دی۔ اس طبقے کے علما کا طریقۂ کار بھی ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا۔ اُن کے طریقۂ کار کا خلاصہ یہ ہے کہ:

1۔ وہ سب سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند اور مرسل حدیث کو لیتے تھے۔

2۔ اور پھر اقوالِ صحابہؓ اور تابعینؒ کو بطورِ استدلال کے سامنے رکھتے تھے۔ ہاں! اگر اُن کے درمیان اختلاف ہوتا اور رسول اللہؐ کی حدیث ظاہری طور پر اُن کے قول کے مخالف ہوتی تو پھر اُن اقوال کو نہ لیا جاتا۔

3۔ اور اگر کسی مسئلے میں احادیثِ رسول اللہؐ میں بھی باہم اختلاف ہوتا تو پھر وہ لوگ صحابہؓ کے اقوال کی طرف رجوع کرتے۔ اگر صحابہ نے:

(الف) آپؐ کی بعض احادیث کے منسوخ ہونے کا تذکرہ کیا۔

(ب) یا حدیث کے ظاہری معنی سے پھیرنے کا کہا۔

www.rahimia.org

(ج) یا انھوں نے اس کی تصریح تو نہیں کی، لیکن ان کا اُس حدیث کو چھوڑنے پر اتفاق تھا۔ اور اُس حدیث کے حکم کے مطابق کسی نے بھی اپنا قول اختیار نہیں کیا۔

یہ تمام وجوہات گویا اس بات کی دلیل تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ حدیث کا حکم یا تو منسوخ شدہ ہے یا تمام حضرات نے اُس میں تاویل کی ہے۔

4۔ اور اگر کسی مسئلے میں صحابہؓ اور تابعینؒ کے مذاہب کا اختلاف ہوگیا تو پھر ہر عالم کے نزدیک وہ مسلک پسندیدہ تھا، جو اُس کے شہر (مدینہ یا کوفہ) کے مشائخ کا مذہب تھا۔

اس طرح اہل مدینہ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ اور ان کے شاگردوں، جیسے حضرت سعید بن مسیّبؒ، —— جو کہ حضرت عمرؓ کے عدالتی فیصلے اور حضرت ابو ہریرہؓ کی احادیث کو یاد رکھنے والے تھے —— کے مذہب کو دوسرے شہروں کے فقہا پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اسی طرح عروہؒ، سالمؒ، عطا بن یسارؒ، قاسمؒ، عبیداللہ بن عبداللہؒ، زہریؒ، یحیٰی بن سعیدؒ، زید بن اسلمؒ اور ربیعہؒ کی بات کو زیادہ قبول کرتے ہیں۔ (اس کی وجہ یہ کہ نبی اکرمؐ نے مدینہ کے بہت سے فضائل بیان کیے ہیں۔ اور اس لیے بھی کہ ہر زمانے کے فقہا اور علما کے اجتماع کا مرکز ہمیشہ مدینہ ہی رہا ہے۔)

اسی طرح اہل کوفہ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے شاگردوں، حضرت علیؓ، قاضی شریح ؒ، اور امام شعبیؒ کے فیصلوں اور حضرت ابراہیم نخعیؒ کے فتاویٰ کو دوسرے شہروں کے اہل علم پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس طرح ہر ایک شہر والوں کا جس کسی مسئلے پر اتفاق ہوگیا، تو انھوں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور ایسے ہی مسائل کے بارے میں امام مالکؒ نے یہ کہا ہے کہ: ''**السنة التی لا إختلاف فیها عندنا کذا و کذا**'' یعنی ''وہ سنت، جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے، ہمارے نزدیک وہ مسائل یہ ہیں۔''

اور اگر ایک شہر والوں کا کسی ایک مسئلے میں آپس میں اختلاف ہوا تو انھوں نے اُس میں سے جو مضبوط یا راجح قول تھا، اُسے لے لیا۔ یا تو اس لیے کہ اُس قول کے کہنے والے کثیر لوگ تھے، یا یہ کہ وہ قیاسِ قوی سے موافقت رکھتا تھا۔ اور یا یہ کہ کتاب و سنت سے اُس کی تخریج ہوئی۔ یہ وہ مسائل ہیں، جن کے بارے میں امام مالکؒ نے کہا: ''**هذا أحسن ما سمعت**'' یعنی ''جو کچھ میں نے سنا، اُس میں سب سے بہتر بات یہ ہے''۔

اور اگر کسی مسئلے کا جواب اُن فقہی ابواب میں نہیں تھا، جو اُن کے شہر کے گزشتہ بزرگوں کی جماعت سے محفوظ تھیں۔ تو وہ ان کے مذہب کے دائرے سے باہر نکلے۔ اور انھوں نے (احادیث و اقوال کے الفاظ پر مبنی) اشارات اور اُن کے تقاضوں کی اتباع کی۔ اس طرح اس طبقے میں مسائل کو مدوّن کرنے کا

الہام کیا گیا۔ چناں چہ مدینہ میں امام مالکؒ، محمد بن عبدالرحمٰنؒ اور ابن ابی ذویبؒ نے مسائل مدوّن کیے۔ اور مکہ میں ابن جریجؒ اور ابن عیینہؒ نے، کوفہ میں امامِ ثوریؒ نے، اور بصرہ میں ربیع ابن صبیحؒ نے مسائل مدوّن کیے۔ اور یہ تمام کے تمام اُس منہج اور طریقۂ کار کے مطابق چلے، جس کا میں نے ابھی ذکر کیا۔

''مؤطا'' کی ترتیب وتدوین میں امام مالکؒ کا طریقۂ کار

رسول اللہؐ سے روایت کردہ احادیث میں سے مدینے والوں کی حدیث کے سلسلے میں امام مالکؒ زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ اور ان کی سند زیادہ قوی ہے۔ اور وہ علمائے مدینہ میں سے، حضرت عمرؓ کے قضایا، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کے اقوال اور فقہائے سبعہ اور ان کے اصحاب کے اقوال کو زیادہ جانتے ہیں۔ چناں چہ امام مالکؒ اور ان جیسے لوگوں کے ذریعے سے روایت وفتویٰ کا علم قائم ہوگیا۔

جب حدیث و فقہ کا معاملہ حضرت امام مالکؒ کے سپرد ہوا تو انھوں نے حدیث بیان کی۔ فتاویٰ دیے۔ لوگوں کو فائدہ پہنچایا۔ اور اس میں عمدگی اور مہارت کا ثبوت دیا۔ اور انہی پر رسول اللہ کا یہ قول پورے طور پر منطبق ہوتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''قریب ہے کہ لوگ دور دراز سے علم کی تلاش میں آئیں گے۔ پس وہ مدینے کے عالم سے بڑا عالم کہیں بھی نہیں پائیں گے''۔ اور جیسا کہ ابن عیینہؒ اور عبدالرزاقؒ نے روایت کیا ہے۔ اور ان دونوں کا روایت کرنا تمہارے لیے کافی ہے۔

اگر تم چاہتے ہو کہ جو کچھ ہم نے امام مالکؒ کے مذہب کے بارے میں بیان کیا ہے، اُس کی حقیقت معلوم کرو تو کتاب ''مؤطا'' کا مطالعہ کرو۔ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے، تم اُس کے مطابق پاؤ گے۔'' إنتھیٰ **كلام الإمام ولی الله ملتقطا من "باب إختلاف الصحابة والتابعين فی الفروع" و من "باب أسباب إختلاف مذاهب الفقهاء" من "حجة الله البالغه". (19)**

فصل (5): ہمارا طریقۂ تحقیق اور فقہ حنفی کی ''مؤطا'' سے موافقت

آدمی ''علم الاسانید'' (احادیث کی سندوں اور ان کے راویوں سے واقفیت کا علم) کا عالم اسی وقت تک ہوسکتا ہے، جب کہ اُس کو احادیث کے ''متابعات'' اور ''شواہد'' کے اعتبار پر قدرت حاصل ہو۔ اور احادیث پر، تواتر، شہرت، صحت یا غرابت اور ضعف ــــ جس درجے کی وہ حدیث ہو ــــ کا حکم لگانے کی صلاحیت حاصل ہو۔ نیز اُسے عام طور پر آئمہ محدثین کے اجتہادات سے موافقت حاصل ہو۔

اہل علم کی اکثریت کا اتفاق ہے کہ صحیح احادیث پانچ کتابوں سے باہر نہیں۔ ''صحیحین'' (بخاری اور مسلم)، ''سنن لأبی داؤد''، ''سنن نسائی'' اور ''سنن ترمذی''۔ بہت کم حدیثیں ایسی ہیں، جو ان کتابوں میں نہ ہوں۔ اگر کوئی حدیث کا طالبِ علم مصنّفین کی جانب سے روایات کے صحت اور ضعف کے بارے میں پائے جانے

والے انتشار سے واقف ہو، اور پھر اپنے اساتذہ کے سامنے "مؤطا" پڑھنے کے بعد ان (پانچ صحیح) کتابوں کو پڑھ لے۔ تو بہت تھوڑی مدت میں تواتر یا حدِ شہرت کو پہنچنے والی احادیث کا پورا یقین حاصل کر لے گا۔

پھر جب ہم نے "مؤطا" کو سب سے پہلے رکھا، تو یہ مذکورہ پانچ کتابیں "مؤطا" کی اکثر احادیث کی تخریج کے لیے کافی ہیں۔ اس طرح آسانی کے ساتھ آدمی صاحبِ بصیرت اور محقق بن جاتا ہے۔ چناں چہ میں اپنے درس و تدریس کے زمانے میں اس طریقۂ تعلیم کے مطابق احادیث کے مطالعے میں مشغول ہوا۔ یوں میرے لیے احادیث کے سلسلے میں تحقیق کی آسانی پیدا ہوگئی۔

لیکن اگر ہم امام بخاریؒ کی کتاب کو بنیادی اور اصل کتاب قرار دیں اور اُس کی احادیث کی تخریج کرنے میں مشغول ہوں تو ہم ایسی اجنبی کتابوں کے محتاج بن جاتے ہیں، جو بہت کم پائی جاتی ہیں۔ اور ان پر اعتماد کرنا غلطی سے خالی نہیں۔ اور اس طرح ہم خود اسانید کی تحقیق پر قدرت حاصل نہیں کر سکتے۔ پھر ہمیں جامع صحیح بخاری کی روایات کی تحقیق کے سلسلے میں مجبوراً حافظ ابن حجرؒ پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ بات اسانید کی تحقیق کے حوالے سے کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

اسانید کی تعلیم و تحقیق سے فراغت کے بعد جب ہم نے اس بات کی کوشش کی کہ فقہ کو ''مؤطا'' کے ساتھ تطبیق دی جائے تو اس کے لیے ہم نے یہ طریقۂ کار اپنایا کہ فقہ میں مذہبِ حنفی کی اُن روایات کو لیا جائے، جو ''مؤطا'' کے موافق ہیں۔ اس طریقۂ کار میں امام ولی اللہ دہلویؒ ہمارے لیے نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور فقہ حنفی کے اس مسلک میں ہم اُن کی اتباع میں چلتے ہیں۔ فقہ حنفی کو ہم اس لیے قبول کرتے ہیں کہ ہندوستان کے عام لوگ حنفی ہیں۔ اور اگر ہم کسی ایسے علاقے میں پیدا ہوتے کہ جہاں کے عام لوگ امامِ شافعیؒ کے مسلک کی اتباع کرتے ہیں تو ہم ضرور اسی طریقۂ کار کے مطابق مذہب شافعیؒ کو ''مؤطا'' امام مالکؒ کے ساتھ تطبیق دے دیتے۔

علوم حاصل کرنے والے لوگوں کی ایک تھوڑی جماعت نے ہم سے فقہ و حدیث کا یہ طریقہ سیکھا۔ اس پر اللہ کی حمد و ثنا ہے۔ اور انھوں نے مجھ سے ولی اللّٰہی طریقے کی حقیقت معلوم کی۔ اور اہلِ حدیث اور دیوبندیوں کے درمیان فرق جاننا چاہا کہ ان میں سے ہر ایک امام ولی اللہ دہلویؒ کی اتباع کا دعوے دار ہے۔ تو پس میں ولی اللّٰہی جماعت اور اس کے دو حصوں میں تقسیم ہونے کی تاریخ بیان کی طرف متوجہ ہوا۔ واللّٰہ ولیّ التّوفیق

باب (10): ولی اللّٰہی جماعت کے بیان میں

فصل (1): ولی اللّٰہی نظریہ و فکر کے بانی اوّل

شیخ الاجل حضرت شیخ عبدالرحیم بن وجیہ الدین دہلوی قدس سرہ نے عالم گیرؒ کی قائم کردہ اسلامی سوسائٹی سے علوم و معارف حاصل کیے۔ اور آپ کے نانا شیخ رفیع الدین دہلویؒ کے پاس اُن کے سلسلے سے ایک تواتر کے ساتھ جتنے معرفت کے خصوصی اُمور تھے، وہ انھوں نے اپنی والدہ کے ذریعے سے حاصل کیے۔ شیخ رفیع الدین ایک خاص طریقے کے وارث تھے، جو انھیں اپنے والد حضرت قطب العالم دہلویؒ سے حاصل ہوئے۔ اور انھوں نے اپنے والد امام عبدالعزیز بن حسن دہلویؒ المعروف ''بحرمواج'' سے، اور انھوں نے اپنے والد کمال الحق والدین حضرت حسن بن طاہر دہلویؒ المتوفی 909ھ (1503ء) سے حاصل کیے تھے۔

اس طرح شیخ عبدالرحیم دہلویؒ کی طبیعت میں ایسی تجدیدی کیفیات ظاہر ہوئیں، جن سے انھوں نے تدریس و تعلیم اور رُشد و ہدایت میں ایک خاص طریقہ ترتیب دیا۔ پس اللہ نے آپؒ کے قلب پر یہ الہام کیا کہ وہ عام تفسیری مباحث اور صرف و نحو کی دقیق بحثوں سے ہٹ کر صرف قرآن حکیم کے معانی اور اس کے علوم و معارف کو سمجھنے کی طرف متوجہ ہوں۔ ایسے ہی اللہ نے آپؒ پر یہ الہام بھی کیا کہ وہ حکمتِ عملیہ کی طرف پوری طرح توجہ دیں۔ تاکہ سنت نبویہؐ کے علوم و معارف کی صحیح تشریح کی جاسکے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے والد سے اس طریقے کی تعلیم حاصل کی۔ اور پھر انھوں نے اُن کی روحانیت سے خصوصی علوم و معارف کی تربیت حاصل کی۔ اس طرح اللہ نے انھیں علم و شعور پر مبنی ایک طریقے کو مہذب و مرتب کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

فصل (2): ولی اللّٰہی فکر و عمل کے چار بنیادی اُمور

میرے نزدیک یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ تحقیق و تجدید پر مبنی جس طریقے کی طرف حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ دعوت دیتے ہیں، اس کی بنیاد، اُن کے والد شیخ الاجل حضرت شاہ عبدالرحیم بن وجیہ الدین دہلوی قدس سرہ نے رکھی تھی۔ ولی اللّٰہی فکر و عمل کی دعوت کے بڑے بڑے اور بنیادی اُمور چار ہیں:

اوّل: قرآن حکیم میں براہِ راست غور و فکر اور تدبر

قرآن حکیم سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مفسرین کی آرا کے بغیر اللہ کے کلام میں تدبر و تفکر

www.rahimia.org

کیا جائے۔ اور اسے سب سے مقدم سمجھا جائے۔ چناں چہ (شاہ ولی اللہ دہلویؒ) نے اللہ کے کلام میں تدبر و تفکر کے اصول مرتب و مدوّن کیے۔ اور اُن اصولوں پر مبنی کتاب کا نام ''الفوز الکبیر'' رکھا۔ یہ اصول دراصل شیخ عبدالرحیم دہلویؒ کے طرزِ تفکر سے ماخوذ ہیں۔

امام ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''بوارق المعرفت'' میں لکھا ہے کہ:

''حضرت والد صاحب قدس سرہ تہجد کے نوافل، اشراق کے نوافل، چاشت کے نوافل اور نمازِ مغرب کے بعد دو رَکعات بطورِ وظیفہ پڑھتے تھے۔ اور عذر کے علاوہ ہمیشہ تلاوتِ قرآن حکیم میں مشغول رہتے تھے۔ اور آپؒ قواعدِ تجوید کی رعایت کرتے ہوئے انتہائی خوش الحانی سے قرآن حکیم پڑھتے تھے۔ اور تلاوت کے علاوہ بھی اکثر اپنے احباب کے حلقے میں ہر روز دو یا تین رکوع پورے تدبر اور اُن کے معانی کے بیان کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔'' اِنتھیٰ (20)

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''الجزء اللطیف'' میں لکھا ہے کہ:

''میں نے علمِ تفسیر میں ''تفسیر بیضاوی'' اور ''تفسیر مدارک'' کے کچھ حصے پڑھے ہیں۔ اور کئی بار حضرت والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر قرآن عظیم کو بڑے تدبر اور اُس کے معانی میں غور و فکر، شانِ نزول اور تفاسیر کے مکمل مطالعے کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا سینہ (قرآن حکیم کے علوم و معارف کے حوالے سے) بہت زیادہ کھل گیا۔ والحمدللہ۔'' اِنتھیٰ (21)

امام ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن حکیم کو پورے تدبر اور غور و فکر کے ساتھ پڑھنے کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنا لیا۔ چناں چہ آپؒ نے حرمین شریفین کے سفر 1143ھ (1730ء) پر آنے سے پہلے ''فتح الرحمن'' لکھنا شروع کر دی تھی۔

اسی بنیاد پر آپؒ کے صاحبزادگان نے آپؒ کی اتباع کی۔ چناں چہ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے (تفسیر) ''فتح العزیز'' لکھی۔ جو دراصل اُن کے قرآن عظیم میں غور و فکر اور تدبر کے نمونے کا درجہ رکھتی ہے۔ جس میں انھوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کو سامنے رکھتے ہوئے آیات کے معانی اور مفاہیم کی تطبیق پیدا کی ہے۔ اور شیخ رفیع الدین دہلویؒ نے اردو زبان میں لفظی ترجمہ کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی تفسیر کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ اور اس سلسلے میں شیخ عبدالقادر دہلویؒ کی تفسیر ''موضح القرآن'' امامت کا درجہ رکھتی ہے۔

ہندوستان کے علما کی ایک جماعت نے شیخ عبدالقادر دہلویؒ کے طرز پر اُردو زبان میں کئی تفاسیر لکھیں۔ اور ہمارے استاذ شیخ الہندؒ نے ''موضح القرآن'' میں سے پُرانے متروک الفاظ نکال کر اس زمانے کے مطابق اُس کی اصلاح کی ہے۔ اور اس کا نام ''موضح الفرقان'' رکھا ہے۔ اور میں نے اپنے شیخ قدس سرہ سے اُس کے کچھ حصے براہِ راست سنے ہیں۔

www.rahimia.org

دوم: احادیثِ نبویہ ؐ کے فہم میں محققانہ طرزِ فکر و عمل

احادیثِ نبویہ ؐ کے سلسلے میں تحقیقی مقام تک پہنچنے کے لیے اجتہاد کے عمل کو آسان بنانا۔ اور صریح احادیث اور معروف سنت کے موافق جو مذاہب ہیں، انھیں اختیار کرنا۔ یہ ملکہ حضرت شیخ عبدالرحیم دہلویؒ میں اجمالی طور پر موجود تھا۔ اسی سے امام ولی اللہ دہلویؒ متأثر ہوئے۔ چناں چہ آپؒ ''بوارق المعرفت'' میں لکھتے ہیں:

''یہ بات نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ حضرت والد صاحبؒ اکثر اُمور میں مذہبِ حنفی کے موافق عمل کرتے تھے۔ ہاں بعض مسائل میں حدیث کے مطابق یا اپنے وجدان کے مطابق کسی دوسرے مسلک کو ترجیح دیتے تھے۔ اُن مسائل میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اقتدا کی حالت میں سورۃ فاتحہ پڑھا کرتے تھے۔ اور جنازے میں بھی سورۃ فاتحہ پڑھتے تھے۔ ایک دن اس مسئلے میں شیخ عبدالاحد (بن شیخ محمد سعید سرہندی بن حضرت مجدد الف ثانیؒ) آپ سے بحث کرنے لگے۔ اور اپنے اسلاف سے کچھ عبارتیں نمونے کے طور پر نقل کرنے لگے کہ امام کے پیچھے جماعت کی نماز کا حال ایسا ہے کہ ایک جماعت بادشاہ کے سامنے اپنے حالات پیش کرنے کے لیے کھڑی ہے۔ اب اس جگہ کا ادب یہ ہے کہ ہم اپنے حالات پیش کرنے کے لیے ایک آدمی (امام) پر اعتماد کریں۔ نہ کہ ہر ایک اپنی بات کرنے لگے۔

اس پر حضرت والد صاحب قدس سرہ نے فرمایا: ''اس طرح قیاس کرنا درست نہیں ہے۔ ان دونوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ اس لیے کہ نماز دراصل اللہ تعالیٰ کے سامنے مناجات ہوتی ہے۔ اور نماز میں دعا اور خشوع اور خضوع کے ذریعے سے اپنے نفس کی تہذیب کی جاتی ہے۔ چناں چہ حدیث: ''**لاصلٰوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب**'' (22) اس پر دلالت کرتی ہے۔ اور خدائے تعالیٰ اس طور پر ''**سمیع**'' (بہت زیادہ سننے والا) ہے کہ تمام عالم اگر ایک میدان میں کھڑا ہو اور ہر ایک اپنی اپنی زبان میں جو کچھ مناجات کرے، اُسے سنتا ہے۔ اور کسی ایک کی مناجات اور دعا، دوسرے کی مناجات اور دعا میں کوئی خلل نہیں ڈالتی۔''

بحث کے دوران ہم اس بات پر آگئے کہ بعض اوقات مقتدیوں کی قرأت امام کے قرأت میں خلل ڈالتی ہے۔ لیکن اس زمانے کا حال تو یہ ہے کہ امام کی زبان پر لفظ ''الحمدللہ'' ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں ''صلوٰۃ'' کے معنی کی طرف اسے کچھ توجہ نہیں ہوتی۔ اس لیے امام کی تشویش سے گھبرانا نہیں چاہیے۔

(اس کے بعد امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں: ''کاتب الحروف اس ضمن میں یہ عرض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ''وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۲۰۴﴾ (7:204) (اور جب قرآن پڑھا جائے تو اُسے کان لگا کر سنو! اور چپ رہو! تاکہ تم پر رحم کیا جائے) محض جہری نمازوں پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس کی تاویلات تفسیروں میں موجود ہیں۔'' آزاد) **اِنتھٰی** (23)

www.rahimia.org

امام ولی اللہ دہلویؒ نے ''الجزء اللطیف'' میں لکھا ہے کہ:

''میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کی وفات کے بعد کم وبیش بارہ سال تک دینی اور عقلی کتب کی تعلیم و تدریس میں ہمیشہ مشغول رہا۔ اور میں نے ہر علم میں خوب غور وخوض کیا۔ اور حضرت والد صاحبؒ کی طرف پوری توجہ رکھی۔ انہی دنوں میں مجھ پر توحید کا دروازہ کھلا۔ اور جذب کا راستہ وا ہوا۔ اور سلوک و احسان کے حوالے سے ایک عظیم فائدہ میسر آیا۔ چناں چہ وجدانی علوم فوج در فوج مجھ پر نازل ہونے لگے۔ مذاہبِ اربعہ کی کتابوں اور ان کے اصولِ فقہ اور ان کے استدلالات پر مبنی احادیث کے مطالعے کے بعد میرے دل میں نورِ غیبی کی مدد سے یہ بات پختہ ہوگئی کہ میں فقہائے محدثین کی روِش اور ان کے طریقۂ کار کے مطابق چلوں۔ 12 سال کے بعد میرے دل میں حرمین محترمین کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ اور 1143ھ کے آخر میں حج سے مشرف ہوا۔'' اِنتہٰی (24)

سوم: تصوف اور علومِ دینیہ میں جمع و تطبیق

علم اور تصوف میں جمع و تطبیق۔ یہ کام بھی حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے شیخ اور والدِ گرامی شیخ ابوالفیض عبدالرحیم بن وجیہ الحق والدین کی برکت سے کیا۔ چناں چہ امام ولی اللہ دہلویؒ ''القول الجمیل'' میں لکھتے ہیں:

''کمزور بندے ولی اللہ —— اللہ اُسے معاف کرے اور اُسے سلفِ صالحین کے ساتھ ملائے —— نے اپنے والد شیخ الاجل عبدالرحیم رضی اللہ عنہ کی صحبت اُٹھائی۔ اور ان کو ایک لمبے عرصے تک راضی اور خوش رکھا۔ اور اُن سے علومِ ظاہری کی تعلیم حاصل کی۔ اور آدابِ طریقت کا ادب سیکھا۔ اور ان کی کرامات کا مشاہدہ کیا۔ اور ان سے مشکل مسائل کے بارے میں سوالات کیے۔ اور ان سے طریقت اور حقیقت کے فوائد میں سے بہت کچھ سنا۔ اور ان پر اور ان کے مشائخ پر جو واقعات، حالات اور کرامات جاری ہوئیں، انھیں سنا۔ اللہ سبحانہٗ ان کو میری جانب سے اور تمام استفادہ کرنے والوں کی جانب سے بہترین جزا عنایت فرمائے۔'' اِنتہٰی (25)

شیخ عبدالرحیم دہلویؒ نے لکھا ہے کہ:

''ہمارے طریقے کے پانچ بنیادی اُصول ہیں:

(1) ہمیشہ ذکر اللہ میں مشغول رہنا۔

(2) ہر حالت میں تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرنا۔

(3) بغیر کسی تفریق کے تمام مخلوق کو نفع پہنچانا۔

(4) اللہ کی کسی بھی مخلوق سے اپنے آپ کو افضل نہ سمجھنا۔

www.rahimia.org

(5) اللہ کے حکم اور اللہ کی مخلوق کے سامنے تواضع اختیار کرنا۔'' إنتھٰی (26)

چہارم: سماجی حکمتِ عملی اور علومِ شرعیہ میں جمع و تطبیق

سماجی حکمتِ عملی کی تمام اقسام: (یعنی تمام ارتفاقات) (1) (ارتفاقِ اول) تہذیب الاخلاق۔ (2) (ارتفاقِ دوم) تدبیر المنزل ۔ (3) (ارتفاقِ سوم) سیاست المدنیہ و (4) (ارتفاقِ چہارم) سیاست المدن۔ اور علومِ شرعیہ کے درمیان جمع و تطبیق پیدا کرنا۔

چناں چہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''بوارق المعرفت'' میں لکھتے ہیں:

''اس فقیر نے حضرت والد صاحب قدس سرہ کی مجلسِ صحبت سے حکمتِ عملی اور معاملات کے آداب بہت زیادہ سیکھے۔'' إنتھٰی (27)

اور ''الجزء اللطیف'' میں لکھا ہے:

''انھوں نے مجھے اپنی تمام تر وسعت کے ساتھ حکمتِ عملی کے فوائد سمجھائے کہ اس دور کی تمام تر اصلاح اور درستگی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ اور پھر اس کو کتاب و سنت اور آثارِ صحابہؓ کے ساتھ مضبوط بنانے کی توفیق دی۔'' إنتھٰی (28)

اس طرح ولی اللّٰہی جماعت کی ابتدا اور بنیاد 1101ھ (1690ء) میں شیخ ابوالرضا محمد اور شیخ علامہ میر زاہد کی وفات کے بعد بارھویں صدی ہجری کے آغاز میں شیخ الاجل شیخ عبدالرحیم دہلویؒ کے ذریعے سے ہوئی۔

فصل (3): ''الجادة القويمة المحمدية'' کی تعین

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو اللہ نے ''الجادة القويمة المحمدية'' (محمدی اُسوۂ حسنہ کی شاہراہِ فکر و عمل) کے متعین کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اور ان کو مذہبِ حنفی میں اصلاح کرنے کا بہترین طریقہ الہام کیا۔ چناں چہ آپؒ نے ''فتاویٰ عالم گیریہ'' کی صورت میں مدوّن شدہ فقہ (حنفی) کو ''مؤطا امام مالکؒ'' کی احادیث سے تطبیق دینے کا کام کیا۔ چناں چہ آپؒ نے ''مسوّٰی'' لکھی۔ لیکن اس فن کی پوری تکمیل اور اس کی ترویج کے لیے تیرھویں صدی کے مجدد سراج الہند امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس لیے کہ اُن کی مثال امام ولی اللہ دہلویؒ کے تربیت یافتہ لوگوں میں ایسے ہی ہے، جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ کے اصحاب میں امام ابو یوسفؒ کی تھی۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے اس کام کے نتیجے میں ہمارے شہروں میں رہنے والے ہندوستان کے عام لوگ اس طرز پر مرتب اور مہذب کی گئی فقہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

اس ضمن میں ذہین ترین لوگوں میں کچھ حضرات نے امام ولی اللہ دہلویؒ کے مسلک پر چلتے ہوئے اسی طرز پر تمام علومِ شرعیہ: تفسیر، حدیث اور سلوک کی تحقیق کرنے کی طرف توجہ دی۔ اور اس کو ''جادۂ قویمہ'' کے ساتھ تطبیق

www.rahimia.org

دینے میں مشغول ہو گئے۔ ان حضرات کے چند طبقات ہیں:

1۔ اس سلسلے میں اگر ہم امام ولی اللہ دہلویؒ کو ''مجتہد مستقل'' مان لیں تو ایسے لوگوں کے مراتب کا فرق سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ اس حوالے سے کچھ حضرات تو وہ ہیں، جو ''مجتہد منتسب'' ہیں، جیسے امام عبدالعزیز دہلویؒ اور صدر الشہید مولانا محمد اسماعیل دہلویؒ۔ یہ لوگ سیاست کے آئمہ میں سے ہیں۔

2۔ کچھ حضرات ''مجتہد فی المذہب'' کے درجے پر فائز ہیں، جیسا کہ شیخ الاجل مولانا رفیع الدین دہلویؒ اور صدر السعید مولانا عبدالحئی دہلویؒ۔ یہ لوگ علوم و فنون کی تحصیل اور فن تطبیق کے اماموں میں سے ہیں۔

3۔ کچھ ایسے حضرات ہیں، جو ولی اللّٰہی روایات کے متبحر عالم اور حافظ ہیں۔ اور اصلاً زہد و تقویٰ کے اعلیٰ مقامات پر فائز ہیں، جیسا کہ شیخ الاجل مولانا (شاہ) عبدالقادر دہلویؒ اور صدر الحمید مولانا (شاہ) محمد اسحاق دہلویؒ۔ اور یہ لوگ تعلیم و تدریس کے امام ہیں۔

یہ جماعت ہے، جس کا نام ہم نے ''ولی اللّٰہی جماعت'' رکھا ہے۔ اس جماعت کا اختتام صدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلویؒ المتوفی 1262ھ (1846ء) پر ہوتا ہے۔

فصل (4): ولی اللّٰہی جماعت؛ ایک علمی اور سیاسی جماعت ہے

یہ عظیم الشان جماعت نہ صرف علمی جماعت تھی، بلکہ ایک سیاسی پارٹی بھی تھی۔ اس لیے کہ حکمتِ عملیہ میں غور و فکر اور تدبر کرنا ان کی فقہ کا بنیادی جزو تھا۔

ہندوستانی سلطنت میں سلطان شاہ عالم اول کے زمانے میں شیعہ اُمرا اور سنی اُمرا کے درمیان اختلاف کی صورت میں جو فتنہ پیدا ہوا، وہ سلطان عالم گیر ثانیؒ کے آخری زمانے تک بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس کا نتیجہ ہندو مرہٹہ سرداروں اور انگریزوں کے مسلمانوں پر غلبے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ان مسلسل حوادث کے سبب 1218ھ (1803ء) میں سلطان شاہ عالم ثانی کی مدد اور اس کے نام سے انگریز دہلی میں داخل ہو گئے۔ ان حالات میں امام عبدالعزیز بن ولی اللہ دہلویؒ نے ہندوستان کی مملکت کو ''دارالحرب'' قرار دے دیا۔ (29)

انہی ایام میں ہندوستان میں مسلمان علما کی ایک جماعت پیدا ہوئی، جو اپنی نسبت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی طرف کرتی تھی۔ اس جماعت نے سیاست کے میدان میں ''شریعت'' کا نام استعمال کر کے ولی اللّٰہی جماعت سے اختلاف کیا۔ اور اس کے مقابلے پر آ گئی۔ حال آں کہ امام عبدالعزیز دہلویؒ کے فتویٰ (دارالحرب) کا اس کے علاوہ اور کوئی مطلب نہیں تھا کہ ''مسلمان حکمران دشمن کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے ہیں۔ اب مسلمان ممالک میں دفاع کا فریضہ عام مسلمانوں کے جمہور لوگوں پر عائد ہو گیا ہے۔'' لیکن یہ مطلب فقہا کے کلام سے وہی سمجھ سکتا تھا، جو حکمتِ عملیہ میں ماہر ہو۔ اور فلسفۂ سیاسیات کا شعور رکھتا ہو۔ ہم نے ہندوستانی علما اور ہندوستان کے حکمرانوں میں

www.rahimia.org

سے کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے والد شیخ الاجل حضرت شاہ عبدالرحیم دہلویؒ سے پہلے ان علوم و فنون کی طرف اس طرح توجہ دی ہو، جیسا کہ ولی اللّٰہی جماعت نے ان پر توجہ دی۔

چناں چہ ولی اللّٰہی جماعت کے لوگ قومی اور ملی تحریک کی تنظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چناں چہ وہ امام عبدالعزیز دہلویؒ کی وفات کے قریب 1238ھ (1823ء) میں اس سلسلے میں کام یاب ہوسکے۔ چناں چہ انھوں نے مغربی ہندوستان کے آخری علاقوں کی طرف ہجرت کی۔ تاکہ افغانستان کے پہاڑوں سے متصل اسلامی ممالک کے ساتھ اپنا اتصال قائم کریں۔ چناں چہ انھوں نے اپنے داعی سندھ، قندھار اور کابل کے شہروں میں پھیلا دیے۔(30)

فصل (5): ولی اللّٰہی جماعت کی حکومت

اس جماعت نے 12 جمادیٰ الثانیہ 1242ھ (1827ء) میں پشاور کے قریب ''پنجتار'' میں عارضی ہندوستانی حکومت قائم کرنے میں کام یابی حاصل کی۔ اس حکومت کے ''امیرالمؤمنین'' امام عبدالعزیز دہلویؒ کے خلیفہ، حضرت سید احمد دہلویؒ تھے۔ اور صدر السعید مولانا عبدالحئیؒ (بڈھانوی) اور صدر الشہید مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ، اُن کے وزیر کی حیثیت رکھتے تھے۔

صدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلی میں مقیم تھے۔ اور افرادی قوت اور مال سے اُن کی مدد کرتے تھے۔ اس طرح یہ حکومت تقریباً 4 سال تک چلتی رہی۔ چناں چہ انھوں نے افاغنہ (پشتو بولنے والے علاقوں) کے تمام شہروں میں اور ہندوستان کے بہت سے اطراف میں ''جادۂ قویمہ'' کے مسلک پر چلنے کی تحریک پوری جدوجہد سے چلائی۔ انھیں اس سلسلے میں بہت سی کام یابیاں بھی ملیں۔ اور بہت سی شکستوں سے بھی دو چار ہونا پڑا۔ لیکن وہ کمزور نہیں پڑے۔ بلکہ انھوں نے دریائے سندھ کے پار، پشاور کے ایک بڑے علاقے پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔

جب صدر السعید (مولانا عبدالحئیؒ) 1242ھ (1827ء) میں وفات پا گئے اور ''پنجتار'' کے قریب ''باجوڑ'' کی ایک بستی ''خار'' میں دفن ہوئے تو مولانا محمد اسماعیل صدر الاعظم کے مثل قرار پائے۔ اور مولانا محمد حسن رام پوریؒ (31)——دیوبندی جماعت کے ''إرھاص'' یعنی راہ ہموار کرنے والے——اُن کے معاون بنے۔ اسی دوران انگریزوں نے پشتو بولنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مذہبی اختلافات کے حوالے سے افتراق و انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور اس کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں میں سے اُن لوگوں کو ذریعہ بنایا کہ جو ولی اللّٰہی جماعت کی سیاست میں مخالفت کرنے والے تھے۔ انھوں نے دین میں ملی تفرقہ پیدا کرنے میں اضافہ کرنے کے لیے ''حنفیہ'' اور ''محمدیہ'' کے نام سے فرقے پیدا کیے۔ ''محمّدیہ'' اس لیے کہا گیا کہ اس حکومت کے امیرالمؤمنین، صوفیا کے طریقے پر بیعت لینے کے بعد طریقۂ محمّدیہ یعنی ''الجادّۃ القویمۃ المحمّدیۃ'' کو زندہ

کرنے پر لوگوں سے بیعت لیتے تھے۔

اس حکومت کی شکست وریخت

چناں چہ 1246ھ (1831ء) میں یہ حکومت سب سے پہلے اُس وقت کمزور ہوئی، جب انگریزوں کی سازش کی وجہ سے پشتو بولنے والی بستیوں میں حکومت سے متعلقہ اُمور سرانجام دینے والی جماعتوں نے اُن قاضیوں اور قائدین کو قتل کردیا، کہ جنھوں نے خدمت دین کے لیے اپنا وطن چھوڑا تھا۔ اور امیر کی نصرت کے لیے بیعت کی تھی۔ اور یہ واقعہ اس سال جمادیٰ الثانیہ میں اُس وقت ہوا، جب کہ وہ لوگ ''پنجتار'' میں تھے۔

اس حکومت کو دوسرا بڑا دھچکا اُس وقت لگا، جب کشمیر کی حدود کے قریب ''بالاکوٹ'' نامی بستی میں ذی القعدہ کے مہینے میں شہادت کا واقعہ ہوا۔ جس میں امیر سید احمد اور صدر الاعظم مولانا محمد اسماعیل وصدر الثانی مولانا محمد حسن اور مسلمان آئمہ کی ایک بہت بڑی جماعت سکھوں کے ہاتھوں شہید ہوگئی۔

اس ہول ناک واقعے کے بعد جو لوگ بالاکوٹ میں باقی بچے، انھوں نے امیر نصیرالدین دہلوی —— جو کہ مولانا محمد اسحاق دہلویؒ کے داماد تھے —— کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

فصل (6): ولی اللّٰہی جماعت کے دو حصے: دہلوی اور صادق پوری

امیر نصیرالدین دہلویؒ کی جمات میں فکری افتراق وانتشار پیدا ہوگیا۔ اور اس کا سبب شہدا (کی نعشوں) میں سے امیر الشہیدؒ کے جنازے (نعش) کا نہ ملنا تھا۔ چناں چہ اس کی دو جماعتیں ہوگئیں۔ ولی اللّٰہی جماعت کے اہل حل وعقد، امیر الشہید کی شہادت کا پورا یقین رکھتے تھے۔ لیکن ایک چھوٹی سی جماعت نے اس کا انکار کردیا۔ اور امیر الشہیدؒ کی واپسی کے انتظار کے لیے داعیین کو اِدھر اُدھر پھیلا دیا۔ ان میں سے کسی بھی فرد میں پوری جماعت کو اکٹھا رکھنے کی صلاحیت اور قدرت نہ رہی۔

اور یہ جو کچھ معرکۂ (بالاکوٹ) میں ہوا، اس سے ہندوستان میں اُن کی مدد اور تعاون کرنے والے بھی متاثر ہوئے۔ صدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلویؒ اور ان کے دیگر اصحاب، جو کہ دہلی میں قیام پذیر تھے، شہادت کے قائل تھے۔ اور امیر ولایت علی عظیم آبادی صادق پوریؒ امام (حضرت سید احمد شہیدؒ) کے غائب ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے۔ یہ امیر، صدر الشہید (مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ) کے خاص اصحاب میں سے تھے۔ اور ایک بڑے امام تھے۔ ان کو امیر المؤمنین نے ہندوستان میں جہاد کا داعی مقرر کیا تھا۔ اور وہ بالاکوٹ کے معرکے میں حاضر نہیں تھے۔ اس لیے انھیں امیر المؤمنین کی شہادت کا یقین نہ آیا۔

اس طرح جماعت میں افتراق وانتشار بڑھتا چلا گیا۔ اور سیاست میں ولی اللّٰہی جماعت کے مسلمان مخالف اس کے سبب اُن پر ہنستے تھے۔ اور انگریزوں کا غلبہ دن بدن تمام شہروں پر بڑھتا جا رہا تھا۔

www.rahimia.org

صدرالحمید مولانا محمد اسحاق دہلویؒ اور ان کی تربیت یافتہ جماعت، 1258ھ (1842ء) تک مسلسل اپنے کام میں مشغول رہی۔ لیکن وہ اپنی تمام تر جدوجہد کے باوجود عام مسلمانوں کو جگا نہ سکی۔ اور نہ ہی ولی اللّٰہی جماعت میں سے اختلاف و انتشار کو ختم کر سکی۔ چناں چہ انھوں نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ حجاز کی جانب ہجرت کر لی۔ اور 1262ھ (1846ء) میں مکہ مکرمہ میں وفات پا گئے۔ اُن کی وفات کے بعد طریقۂ ولی اللّٰہی کی طرف نسبت رکھنے والے لوگ دو جماعتوں کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ ایک ''دہلوی جماعت''، جب کہ دوسری ''صادق پوری جماعت'' کی صورت اختیار کر گئی۔

''دہلوی جماعت'' کے اہم رہنما

دہلی میں شیخ الاجل شاہ احمد سعید دہلویؒ اور ان کے بھائی شیخ عبدالغنی دہلویؒ جو کہ امام عبدالعزیز دہلویؒ اور صدرالحمید مولانا محمد اسحاق دہلویؒ کے شاگردوں میں سے تھے۔ صدرالحمید کے طریقے کے مقتدا اور رہنما بنے۔ اور پھر امیر نصیرالدین دہلویؒ کے متبعین میں سے امیر (حاجی) امداد اللہؒ حجاز سے واپس آنے کے بعد اُن کے قائم مقام بنے۔ جب کہ انھوں نے حجاز میں تقریباً دو سال قیام کیا۔ اور اس عرصے میں صدرالحمید حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کی صحبت سے استفادہ کیا۔ صدرالحمید نے انھیں اپنا خلیفہ بنایا۔ ہندوستان واپس آ کر انھوں نے 1264ھ (1848ء) میں ''دہلوی جماعت'' کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ چناں چہ وہ اُن کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق (انگریز کے خلاف آزادی کے لیے) جہاد جاری رکھنے اور عارضی حکومت قائم کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ان کے ساتھ مولانا مملوک العلی دہلویؒ، مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ، مولانا احمد علی سہارن پوری، مولانا محمد قاسم دیوبندیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ وغیرہم نے پورا تعاون کیا۔

اس ''دہلوی جماعت'' کا اصلی مرکز حجاز میں تھا۔ اور مولانا محمد یعقوب دہلویؒ اپنے بڑے بھائی صدرالحمیدؒ کی وفات کے بعد مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ چناں چہ اس جماعت کے ساتھ لوگ دن بدن ان سے ملتے چلے گئے۔

فصل (7): ''صادق پوری جماعت'' کے اہم رہنما

امیر ولایت علی عظیم آبادی کے ساتھ عام طور پر مشرقی ہندوستان کے صوبہ بہار اور بنگال کے لوگ مل گئے۔ وہ 1248ھ (1852ء) میں صادق پور میں بیعتِ جہاد کی تجدید کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنی طرف لوگوں کو دعوت دی، اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو امیر غائب (سید احمد شہیدؒ) کا خلیفہ سمجھتے تھے۔ اُن کے ساتھ شیخ عبدالحق بن فضل اللہ بنارسیؒ بھی مل گئے، جو کہ صدرالشہیدؒ (مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید) سے نسبت رکھنے والوں میں سے تھے۔ اور انھوں نے قاضی شوکانی سے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ چناں چہ یہ لوگ ''صادق پوری جماعت'' کی تنظیم میں مشغول ہو گئے۔ لیکن صدرالحمیدؒ کے احترام کے سبب دہلی اور اس کے اطراف کے علاقوں میں وہ علانیہ طور پر

www.rahimia.org

لوگوں کو (اپنی جماعت کی طرف) دعوت نہیں دیتے تھے۔

1250ھ (1834ء) سے پہلے امیر ولایت علیؒ حجاز آئے۔ اور نجد اور یمن کے علاقوں میں گئے۔ اور امام شوکانیؒ سے تعلیم حاصل کی۔ صدرالحمیدؒ کی حجاز ہجرت کر جانے کے بعد 1258ھ (1842ء) میں امیر ولایت علیؒ نے اپنے بھائی امیر عنایت علیؒ کی قیادت میں ایک وفد ''بُنیر'' (سوات) بھیجا۔ جو امیر شہیدؒ کی واپسی کا انتظار کرنے والوں کا مرکز تھا۔ اور صدرالحمیدؒ کی وفات کے بعد 1262ھ (1846ء) میں امیر ولایت علیؒ بنفس نفیس بُنیر پہنچے۔ اور معاملے کو کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جہاد وقتال پر وہ اتفاق حاصل نہ کر سکے۔ بلکہ وہ انتظار کی حالت میں ہی بیٹھے رہے۔ لوگوں نے امیر ولایت علیؒ سے متعلق کچھ چیزیں امیر امداداللہ تھانویؒ کے واسطے سے بیان کی ہیں۔ چناں چہ ہمارے استاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے یہ بات بیان فرمائی ہے کہ:

''جب حضرت حاجی امداد اللہؒ دہلی تشریف لائے تو مؤمن خان شاعر بغرضِ زیارت حاضر ہوئے۔ اُس زمانے میں مولوی ولایت علی صاحبؒ ممالک سرحدی پر روانہ ہو چکے تھے۔ اور مؤمن خان ان کے نہایت معتقد تھے۔ حضرت سے دریافت کیا کہ: ''کیوں حضرت! مولوی صاحب اپنے مقصد میں کام یاب ہوں گے یا نہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''مجھ کو کیا معلوم!'' مگر انھوں نے پھر اصرار کیا کہ نہیں حضرت! اپنے کشف سے کچھ فرمائیے۔ آپ نے تأمل کر کے فرمایا کہ: ''ان کو فتح نہیں ہوگی''۔ اس پر وہ مکدر ہوئے۔ حضرت نے فرمایا: ''مجھ کو معلوم ہوا کہہ دیا۔ اس میں کدورت کی کیا بات تھی؟''۔ اِنتھیٰ (32)

امیر ولایت علی کا انتقال 1269ھ (1853ء) میں ہوا۔ اور پھر ان کے قائم مقام امیر عنایت علی ہوئے، جن کا انتقال 1273ھ (1857ء) میں ہوا۔

صادق پوری جماعت کا سیاسی اُصول یہ رہا کہ وہ حضرت امیر شہیدؒ کے غائب ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے۔ اور اس اصول کو مان لینے کے بنیادی تقاضے اور لوازمات میں سے یہ بات بھی تھی کہ وہ اپنے امام کے ظہور سے پہلے اُن سلاطینِ اسلام اور مسلمان اُمرا کے ساتھ اشتراکِ عمل نہیں کر سکتے جو کفار سے لڑائی لڑنے کے لیے جہاد کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن امیر عنایت علیؒ کے ماننے والی مجاہدین کی ایک جماعت، اس بات میں اُن کی موافق نہ بن سکی۔ بلکہ وہ لوگ ''دہلوی جماعت'' کی طرف میلان رکھنے لگے۔

فصل (8): ''صادق پوری جماعت'' کے اہم رہنما

صادق پوری جماعت کے اکابرین اور آئمہ میں سے شیخ الاسلام سید نذیر حسین بہاری دہلوی ہیں۔ آپ 1220ھ (1805ء) میں پیدا ہوئے۔ اور 1237ھ (1822ء) تک صادق پور میں امیر ولایت علی وغیرہ کے پاس علوم حاصل کرنے میں مشغول رہے۔ پھر 1243ھ (1827ء) میں دہلی آئے۔ اور صدرالحمید کے شاگردوں

سے تعلیم حاصل کی۔ پھر صدر الحمید سے بہت عمدہ طریقے سے اور کثرت سے استفادہ کیا۔

آپ اپنے زمانے کے ذہین ترین لوگوں میں سے تھے۔ علومِ دینیہ کی تمام اقسام اور علومِ عقلیہ وادبیہ کے جامع تھے۔ وہ اپنے شیخ کے طریقے کی پابندی کرتے ہوئے مذہبِ حنفی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ فتاویٰ عالم گیریہ اُن کے سامنے اس طرح تھا، گویا کہ انھوں نے اُسے حفظ کیا ہوا ہے۔ وہ صادق پوری جماعت کی طرف بہت تھوڑا میلان رکھتے تھے۔ لیکن 1274ھ (1857ء) کے بعد اجتہاد کرنے میں خود مستقل ہوگئے۔ وہ اکثر معاملات میں صدر الحمید کی طرف اپنی نسبت کرتے تھے۔ آپ مہارت رکھنے والے امام تھے۔ یمنی لوگوں کی طرف ان کا میلان بہت تھوڑا اور کم تھا۔

اسی جماعت کے ایک اہم فرد امیر قنوجی سید صدیق حسن بھوپالی بھی تھے۔ انھوں نے امیر ولایت علی صادق پوری سے ملاقات کی تھی۔ اور علوم شیخ عبدالحق بنارسی سے حاصل کیے۔ اسی طرح انھوں نے علمائے یمن سے بھی علوم اَخذ کیے۔ وہ امام شوکانی سے بہت زیادہ محبت رکھتے تھے۔ اس طرح کہ ان کے اجتہادات میں تغیرات وتبدلات کے باوجود اُن کی اتباع کرتے تھے۔ البتہ اس اتباع کے حوالے سے ہونے والے تسامح اور غلطی کا تعلق فقط نظریات کے حوالے سے تھا۔ جہاں تک جہاد کے حوالے سے عملی کوشش کا تعلق ہے، تو انھوں نے اُسے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے بہت سی مشقتوں کو برداشت کیا تھا۔ اس حوالے سے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

فصل (9): دونوں جماعتوں کا رُجحانِ فکر و عمل

''دہلوی جماعت'' کا زیادہ تر میلان صدر السعید (مولانا عبدالحیؒ بڈھانوی) اور صدر الحمید (مولانا شاہ محمد اسحاق دہلویؒ) کی طرف تھا۔ جب کہ ''صادق پوری جماعت'' اپنے آپ کو صدر الشہید (مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ) کی طرف زیادہ منسوب سمجھتی تھی۔ لیکن ان دونوں جماعتوں کے تمام لوگ امام شاہ ولی اللہؒ کی امامت پر متفق تھے۔ اور ان کے بعد امام عبدالعزیز دہلویؒ اور پھر ان کے بعد الامیر الشہید سید احمد ''امیر المؤمنینؒ'' پر بھی ان میں اتفاق پایا جاتا تھا۔ لیکن جب ''صادق پوری جماعت'' کے آئمہ میں سے بعض نے محدثین میں سے ظاہریہ، یمن کے زیدیہ اور نجد کے حنابلہ کا دامن تھاما اور صدر الشہید جس مسلک پر تھے، اُس سے باہر نکل گئے۔ تو ان دونوں جماعتوں کے درمیان علوم ومعارف کے معاملے میں بہت زیادہ اختلاف پیدا ہوگیا۔

جب آپ صدر الشہید (شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ) کی کتاب ''تقویة الإیمان'' اور (شیخ عبدالوہاب نجدی کی) ''کتاب التوحید'' پر غور سے نظر ڈالیں گے تو آپ کو ان دونوں کے درمیان ''مشرک کی مغفرت نہ ہونے کے مسئلے'' میں اور ''مشائخ کا وسیلہ پکڑنے کی نفی کے مسئلے'' میں بڑا واضح فرق نظر آئے گا۔ اسی طرح جب آپ صدر الشہید (شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ) کی ''أصول الفقه'' اور امام شوکانیؒ کی ''إرشاد الفحول'' کو بڑے غور سے

پڑھیں گے تو آپ کو اجماع سے استدلال کرنے میں دونوں کے مؤقف میں بڑا واضح اختلاف محسوس ہوگا۔

اور جب آپ صدرالشہید کی کتاب "العبقات" پڑھیں گے تو اُن کا مسلک شیخ محی الدین ابن عربی کے مسلک کے موافق پائیں گے۔ جو کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے حنبلی شاگردوں کے مسلک کے یکسر مخالف ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربیؒ کی بابت میاں نذیر حسینؒ اور نواب صدیق حسنؒ کی رائے

شیخ الاسلام سید نذیر حسین دہلویؒ شیخ محی الدین ابن عربی کو کافر نہ سمجھنے کے سلسلے میں صدرالشہید (مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ) کی اتباع کرتے ہیں۔ چناں چہ کتاب "الحیاۃ بعد المماۃ" (سوانح میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ) میں ہے کہ:

''میاں صاحب (سید نذیر حسین) طبقۂ علمائے کرام میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی بڑی تعظیم کرتے ہیں۔ اور (انھیں) "خاتم الولایة المحمدیه" فرماتے ہیں۔ مولانا قاضی بشیرالدین قنوجیؒ، جو شیخ اکبر کے سخت مخالف تھے، ایک مرتبہ دہلی اس غرض سے تشریف لائے کہ ان کے بارے میں میاں صاحب سے مناظرہ کریں۔ اور دو مہینے دہلی میں رہے۔ اور روزانہ مجلس مناظرہ گرم رہی۔ مگر میاں صاحب اپنی عقیدتِ سابقہ سے ــــ جو شیخ اکبر کی نسبت رکھتے تھے ــــ ایک تل کے برابر بھی پیچھے نہ ہٹے۔ آخر مولانا ممدوح دو مہینے کے بعد واپس تشریف لے گئے۔

مولانا ابوالطیب محمد شمس الحق نے بھی میاں صاحب سے کئی دن متواتر شیخ اکبر کی نسبت بحث کی۔ اور "فصوص الحکم" پر اعتراضات جمائے۔ میاں صاحب نے پہلے تو سمجھایا، مگر جب دیکھا کہ ابھی "لانسلم" (ہم تسلیم نہیں کرتے) کے کوچے میں ہیں تو فرمایا کہ: "فتوحاتِ مکیه" آخری تصنیف شیخ اکبر کی ہے۔ اور اس لیے اپنی سب تصانیفِ سابقہ کی یہ ناسخ ہے۔'' اس جملے پر یہ سمجھ گئے۔'' اِنتھٰی (33)

اسی طرح امیر قنوجیؒ نے (شیخ محی الدین ابن عربی کی) عدمِ تکفیر کی طرف رجوع کرلیا تھا۔ چناں چہ وہ اپنی کتاب "التاج المکلّل" میں لکھتے ہیں کہ:

''اس سلسلے میں راجح مذہب وہی ہے، جو ایسے علمائے محققین کا مذہب ہے، جو علم و عمل اور شریعت اور سلوک کے جامع ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اُن (شیخ محی الدین ابن عربی) کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے۔ اور ان کی ایسی باتوں کو جو ظاہر شریعت کے مخالف ہیں، اچھے مفاہیم پر محمول کرنا چاہیے۔ اور ان کو اور دیگر اُن مشائخ کو ــــ جن کا دین میں تقویٰ اور پرہیزگاری ثابت شدہ ہے ــــ کافر قرار دینے سے اپنی زبان کو روکا جائے۔ دنیا میں مسلمانوں کے درمیان ان کا علم و شعور غالب رہا ہے۔ اور وہ لوگ عمل صالح کرنے میں بڑے بلند مقام پر فائز تھے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے استاذ امام علامہ شوکانی کی کتاب "فتح الربانی" میں دیکھا ہے کہ

www.rahimia.org

اُن کا رُجحان بھی اسی طرف تھا۔ چناں چہ انھوں نے لکھا ہے کہ: ''اُن (محی الدین ابن عربی) کے کلام کے بہت سے مطلب ہو سکتے ہیں۔ اور انھوں نے اپنے اوائل عمر میں جو کچھ لکھا تھا، چالیس سال بعد اس سے رجوع کرلیا تھا۔''

جہاں تک شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد حافظ ابن القیم اور ان جیسے لوگوں کا معاملہ ہے، تو ان لوگوں نے شریعت مطہرہ کا دفاع کیا ہے۔ اور یہ ان کا منصب ہے۔ ان کی تنقید کو نفسانی جھگڑے میں شمار نہیں کرنا چاہیے۔ اور نہ ہی اسے اُس حسد کا شاخسانہ سمجھنا چاہیے، جو علمائے دنیا میں سے اکثر اہلِ علم کے درمیان جاری رہتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر ایک اپنے نظریے کے مطابق رُجحانِ فکر رکھتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس میں کوئی شبہ اور شک نہیں کہ ایک بہت بڑی جماعت اُن کی تکفیر کی طرف گئی ہے۔ اور ان کے بارے میں ایسی باتیں کی ہیں، جن کا کوئی حساب نہیں۔ جیسا کہ میں نے اپنی کتاب ''ابجد العلوم'' میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

میں اس کتاب میں یہ کہتا ہوں کہ اس سلسلے میں درست بات وہ ہے، جسے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی اور شیخ الاجل مسند الوقت احمد ولی اللہ محدث دہلوی اور إمام المجتهد الکبیر محمد شوکانی نے اختیار کیا ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت محی الدین ابن عربی کے اُس کلام کو، جو کتاب وسنت کے موافق ہے، مکمل طور پر قبول کیا جائے۔ اور ایسا کلام، جو کتاب وسنت کے بظاہر مخالف ہے، اُس میں ایسی تاویل کی جائے کہ جو اچھے مفاہیم پر محمول ہوتی ہو۔ اور ان کے بارے میں ایسی گفتگو ہرگز نہ کی جائے، جو اہلِ علم و ہدایت کے شایانِ شان نہ ہو۔ باقی اللہ تعالیٰ مخلوق کے دلوں کی پوشیدہ حالتوں کو زیادہ جانتا ہے۔ قرآن اور حدیث کی بنیاد پر قائم علم کی شان یہ ہوتی ہے کہ اُس کے عمل میں تقویٰ اور پرہیزگاری پیدا ہو۔ اور اسی پر اسلام و ایمان اور احسان کی صحت کا دارومدار ہے۔ اور یہ دونوں باتیں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی میں مکمل طور پر پائی جاتی تھیں۔ اس معاملے میں کوئی بھی دو رائے نہیں ہیں۔

حضرت محی الدین ابن عربی، سنت کی اتباع کرنے اور اجتہاد کے ایسے مقام پر فائز تھے کہ ان کے قلم کی زبان، اس کو مکمل طور پر بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتی تھی۔ دلائل شرعیہ کے مطابق عمل کرنے اور اس میں ان کے انتہائی شغف رکھنے کی وجہ سے ان کا کلام ان باتوں کا احاطہ کرنے سے قاصر تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہماری طرف سے اور تمام مسلمانوں کی طرف کی اچھی جزا عنایت فرمائے۔ اور سید الاصفیا، خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم —— جو انتہائی اشرف واکرم اور اعظم ہیں —— کے وسیلے سے ہم پر ان کے انوارات کا فیضان کرے۔ اور ان کے راز و اَسرار کا لباس ہمیں پہنائے۔ اور ان کے عشق کی شراب کے پیالے ہمیں پلائے۔ اور ان کے احباب کے زُمرے میں ہمارا حشر کرے۔'' اِنتہیٰ (34)

www.rahmia.org

فصل (10): ولی اللّٰہی جماعت مجتہدین کی جماعت ہے

''صادق پوری جماعت'' کے بعض امام، امام ولی اللہ دہلویؒ کی اتباع سے بھی باہر نکل گئے۔ اس لیے کہ امام ولی اللہ دہلویؒ کی تحریرات، مذاہبِ اربعہ کی پابندی اختیار کرنے اور علامہ ابن حزم پر ردّ کے سلسلے میں ''حجة الله'' میں مشہور ہیں۔ ایسے ہی دونوں جماعتوں کے درمیان فروع میں پیدا ہونے والا اختلاف بھی ایسے لڑائی جھگڑے تک پہنچ گیا، جو طریقۂ ولی اللّٰہی میں قطعاً ممنوع ہے۔ صدر الشہید رکوع اور اس سے اُٹھتے ہوئے رفع یدین کے عمل کو مستحب سمجھتے ہوئے کیا کرتے تھے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ مستقل رفع یدین کرنے سے فتنہ اور فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، تو انھوں نے رفع یدین ترک کر دیا۔

اس تمام تر اختلافات کے باوجود یہ ولی اللّٰہی جماعت مجتہدین پر مشتمل ہے۔ خیر اور بھلائی کے سوا ان کا کوئی اور مقصد ہرگز نہیں تھا۔ یہ لوگ بہت اونچے اجر کے مستحق ہیں۔ اور ان کا تذکرہ عمدہ الفاظ میں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ انھوں نے ہندوستان کی عارضی حکومت کے بعد ''بُنیر'' (سوات) میں ہندوستانی حکومت و امارت کا مرکز پوری مستقل مزاجی کے ساتھ قائم رکھا تھا۔

باب (11): ''اہل حدیث'' اور ''دیوبندی جماعت'' کے بیان میں

فصل (1): 1857ء کی جنگِ آزادی اور ولی اللّٰہی جماعت کا کردار

جب سلطانِ دہلی (بہادر شاہ ظفرؒ) کی قیادت میں ہندوستانیوں اور قابض انگریزوں کے درمیان 1273ھ (1857ء) میں جنگ ہوئی تو ''ولی اللّٰہی دہلوی جماعت'' نے مسلمانوں پر لازمی قرار دیا کہ وہ اس لڑائی میں پوری طرح شرکت کریں۔ اس لیے کہ انگریز مسلمان حکومت میں ہندوستانی بادشاہوں کے ساتھ قطعی معاہدے کر کے کام کر رہے تھے۔ اور ''السلطنة التشريعية'' یعنی شریعت کے آئینی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کو حکومت پر پورا قبضہ حاصل تھا۔ اس لیے کہ ہندوستان کی تمام فوجیں اور لشکر بادشاہوں کے نام پر کنٹرول کیے جاتے تھے۔ اور انگریزوں پر یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کے دینی اُمور میں قطعاً کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔

1273ھ (1857ء) میں دہلی میں ایسے بہت سے واقعات ہوئے، جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ انگریز افسران ان معاہدات کو توڑ رہے ہیں۔ اور دینی اُمور میں مداخلت کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں ولی اللّٰہی دہلوی جماعت کے تمام لوگوں کا اس پر اتفاق تھا کہ معاہدات کی وجہ سے انگریزوں کو جان، مال اور امن کا تحفظ جو پہلے

www.rahimia.org

حاصل تھا، وہ ختم ہوگیا۔ اور یہ بات اُس ہندوستانی فوج میں پھیل گئی، جسے انگریزوں نے بادشاہ کے نام پر بنایا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبل از وقت فوجیوں نے لڑائی کا آغاز کردیا۔

دہلی اور اس کے اطراف میں چار مہینے کی مدت میں 70 کے قریب معرکے بپا ہوئے۔ اس دوران حیدرآباد اور کابل کے حکمرانوں نے ان کی کوئی مدد نہ کی۔ اس کے باوجود کہ ان پر مدد کرنا لازم تھا۔ بلکہ انھوں نے اِنہیں بے یارو مددگار چھوڑ دیا۔ اور ان کو ذلیل ورُسوا کردیا۔ اور دشمنوں کے ساتھ مل گئے۔ اس طرح محرم 1274ھ (1857ء) میں اس جماعت کو شکست ہوگئی۔ پھر قتل، قید کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور لوگ بھاگنے لگے۔ پھر مت پوچھو کہ اس سال لوگوں پر کیا گزری۔

امیر امداداللہ ان جنگوں میں سے بعض (یعنی جہادِ شاملی) میں امیر اور قائد تھے۔ جن میں شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم دیوبندیؒ اور شیخ الاسلام مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ان کے نائبین میں سے تھے۔ ان میں سے شیخ محمد (ضامن) خان تھانویؒ شہید ہوگئے۔ اور مولانا محمد قاسمؒ (نانوتوی) روپوش ہوگئے۔ جب کہ مولانا رشید احمدؒ (گنگوہی) گرفتار ہوگئے۔ اور امیر امداداللہ حجاز کی طرف ہجرت کرگئے۔

اسی طرح دہلی پر انگریزوں کے تسلط کے بعد شیخ احمد سعید دہلوی اور شیخ عبدالغنی دہلوی (یہ دونوں حضرات شیخ ابوسعید دہلوی کے صاحبزادگان اور حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کے خلیفہ ہیں۔ آزاد) بھی حجاز تشریف لے آئے۔ لیکن ''صادق پوری جماعت'' اس لڑائی میں نہ صرف شریک نہیں ہوئی، بلکہ ایک کنارے پر کھڑی رہی۔ اور اس سلسلے میں ''دہلوی جماعت'' کے کچھ لوگ بھی ان کے ساتھ مل گئے۔ جیسا کہ شیخ محمد (محدث) تھانویؒ، کہ انھوں نے امیر امداداللہ تھانویؒ پر (جہادِ آزادی کے سلسلے میں) اعتراض کیا تھا۔ اور مولانا محمد قاسم دیوبندیؒ نے انھیں لاجواب کردیا تھا۔ اس باہمی گفتگو کی تمام تفصیلات میرے سامنے، ہمارے اُستاذ حضرت شیخ الہندؒ نے بیان فرمائی تھیں۔

اس سے پہلے ''دہلوی جماعت'' اور ''صادق پوری جماعت'' کے درمیان اگرچہ بہت سے اصولوں میں اختلافات پیدا ہوگئے تھے۔ اور اس اختلاف کی نوعیت اور صورت ایسے ہی تھی، جیسا کہ فروعات میں فقہائے مجتہدین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن جب ''صادق پوری جماعت'' کی جانب سے، امام (سید احمد شہیدؒ) کے واپس لوٹنے کے عقیدے پر اعتماد رکھنے اور ان کے ظہور سے پہلے انگریزوں سے لڑائی میں شرکت نہ کرنے کا عمل ظاہر ہوا، تو دونوں جماعتوں میں مکمل طور پر انقطاع ہوگیا۔ اس طرح دونوں جماعتوں کے درمیان بڑی وسیع دیوار حائل ہوگئی۔

فصل (2): 1857ء کے بعد ولی اللّٰہی جماعت کی آزمائش

جنگِ آزادی 1857ء میں شکست کے بعد جب کہ ولی اللّٰہی دہلوی جماعت کے اراکین قید، جلاوطنی، قتل اور ہجرت کی آزمائشوں سے گزر رہے تھے، شیخ الاسلام سید نذیر حسین دہلویؒ، دہلی میں اطمینان وسکون سے قیام پذیر

تھے۔ اور ''صادق پوری جماعت'' بالکل محفوظ و مامون تھی۔ شیخ نذیر حسینؒ نے مستقل اجتہاد کا دعویٰ کردیا۔ اور فقہ کے مذاہبِ اربعہ کی پابندی چھوڑ دی۔ اور صرف حدیث کی اتباع کی دعوت دینے لگے۔

لیکن 1280ھ (1863ء) میں بُنیر (سوات) میں امیر عنایت علی کے شاگردوں میں سے کچھ لوگ صادق پوریوں پر غالب آگئے، جن کا رُجحانِ فکر و عمل ''دہلوی جماعت'' کی طرف تھا۔ چناں چہ وہ ''امبیلہ'' میں انگریزوں پر چڑھ دوڑے۔ پھر ''صادق پوری جماعت'' پر بھی وہی کچھ گزری، جو ''دہلوی جماعت'' پر گزری تھی۔ ان کے لوگوں کو بھی جلاوطن کردیا گیا۔ ان کے مال لوٹ لیے گئے۔ انگریزوں نے ان کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اور ان کے مددگار لوگوں کو گرفتار کرلیا۔ چناں چہ شیخ الاسلام نذیر حسین دہلوی بھی ایک سال گرفتار رہے۔ (35)

''صادق پوری جماعت'' سے ''اہل حدیث'' بننے کا عمل

اس دوران ''علی گڑھی جماعت'' کے بانی سر سید احمد خاں ''صادق پوریوں'' کے دفاع کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس سلسلے میں شیخ الاسلام (سید نذیر حسین) کے شاگردوں میں شیخ ابوسعید محمد حسین لاہوری نے کوششیں کیں۔ اس طرح ''صادق پوری جماعت'' کا پروگرام تبدیل ہوکر ''علی گڑھی جماعت'' کے قریب ہوگیا۔ اور انھوں نے حکومت کی سختیوں سے مجبور ہوکر اپنا نام ''اہل حدیث'' رکھ لیا۔

ان کے بعد ایسے لوگ آئے کہ جن کا اعتقاد یہ تھا کہ یہی حقیقت میں ''مذہبِ اہل حدیث'' ہے۔ پھر ان ''اہل حدیث'' میں بھی دو جماعتیں: (۱) غالی اور متشدد لوگوں اور (۲) اعتدال پسندوں کی بن گئیں۔ اس طرح ہر جماعت مختلف استعدادات کے حامل لوگوں کی وجہ سے تقسیم در تقسیم میں مبتلا ہوگئی۔

فصل (3): ''دارالعلوم دیوبند'' کا قیام اور ''ولی اللّٰہی دیوبندی جماعت''

''ولی اللّٰہی دہلوی جماعت'' کے رہنما حجاز میں جمع ہوئے۔ اور انھوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ ''دہلی کالج'' کے نمونے پر ہندوستان میں ایک جامع دینی مدرسے کی بنیاد رکھی جائے۔ ''دہلی کالج'' وہ ہے، جس کی بنیاد امام عبدالعزیز دہلویؒ کے زمانے میں رکھی گئی تھی۔ اور اس کی مدرسین میں صدرالسعید مولانا عبدالحیٰؒ تھے۔ پھر ان کے بعد ہمارے اساتذہ کے شیخ، شیخ رشیدالدین دہلویؒ اور پھر استاذ الاساتذہ مولانا مملوک العلی دہلویؒ اس کے مدرسین میں سے رہے ہیں۔ یہ کالج 1274ھ (1857ء) کی جنگِ آزادی کے بعد بند کردیا گیا تھا۔

ایک جامع مدرسہ کے قیام پر اتفاق کے بعد، یہ جماعت مدرسے کی بنیاد رکھنے میں مصروف و مشغول ہوگئی۔ اور دہلی کے قریب دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کرنے میں کام یاب ہوئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے 10 محرم 1282ھ/ 29 مئی 1866ء کو اس کا آغاز کردیا۔ انہی ایام میں اس جماعت کا نام ''دیوبندی جماعت'' رکھا گیا۔ جب کہ اس سے پہلے وہ ''دہلوی جماعت'' کے حوالے سے پہچانی جاتی تھی۔

www.rahimia.org

اس جماعت کے رہنما حجاز میں مقیم تھے۔ ان میں سے امیر امداداللہ تھانویؒ اور امام عبدالغنی دہلویؒ تھے۔ یہ حضرات یہ چاہتے تھے کہ اسلام کے مرکز کو حجاز میں مضبوط کیا جائے۔ اور ہندوستانی تحریک کے مرکز کی تجدید، افغانستان کے پہاڑوں میں کی جائے۔

ہندوستان میں امیر امداداللہ تھانوی کے نمائندے ہمارے استاذ کے استاذ شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم دیوبندیؒ تھے۔جنھوں نے 1297ھ (1880ء) میں وفات پائی۔کمالاتِ امدادیہ میں لکھا ہے کہ:

''حضرت حاجی (امداداللہ) صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان (زبان) عطا فرماتے ہیں۔ چناں چہ شمس تبریزیؒ کے واسطے، مولانا رومیؒ کو (اُن کی) لسان بنایا تھا۔ اور مجھ کو مولانا محمد قاسم صاحب لسان عطا ہوئے ہیں۔ جو میرے قلب میں آتا ہے، مولوی صاحب اس کو بیان کردیتے ہیں۔'' انتھیٰ (36)

ان کے قائم مقام ہمارے شیخ، شیخ الاسلام ابومحمود رشیداحمد گنگوہیؒ جامعہ قاسمیہ (دارالعلوم دیوبند) کے رئیس ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ شیخ حسین احمد دیوبندیؒ نے امیر امداداللہ تھانویؒ سے یہ روایت کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

''مولوی محمود حسن کو کم نہ سمجھو۔ وہ اپنے زمانے کا شیخ ہوگا۔'' (37)

ہمارے استاذ شیخ الہند (حضرت گنگوہیؒ کے زمانے میں) جامعہ کے نائب رئیس تھے۔ اور جب شیخ الاسلام حضرت مولانا رشیداحمد گنگوہیؒ کا 1323ھ (1905ء) میں انتقال ہوگیا تو ہمارے استاذ شیخ الہندؒ جامعہ قاسمیہ (دارالعلوم دیوبند) کے رئیس بن گئے۔

فصل (4): 1857ء کے بعد کے حالات کا تجزیہ

1857ء کے بہت بڑے انقلاب کے بعد، جب کہ:

(۱) حکومت سے مسلمان ذہنیت رکھنے والے تقریباً 300 ملین لوگ نکال دیے گئے۔

(۲) ملک کی سرکاری اور علمی زبان، فارسی اور عربی سے تبدیل کرکے انگریزی بنادی گئی۔

ایسے حالات میں محض درج ذیل طریقوں کے مطابق دین کی تعلیم دینا کافی نہ تھا:

(۱) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا طریقۂ تعلیم۔

(۲) امام ولی اللہ دہلویؒ کا طریقۂ تعلیم۔

(۳) علمائے یمن کا ایسا طریقۂ تعلیم جو فقہا کے مذاہب کی پابندی کو قبول نہیں کرتا تھا۔

اس لیے کہ پہلے دونوں طریقہ ہائے تعلیم سلطنتِ اسلامیہ کے قیام کے محتاج ہیں۔ ان طریقہ ہائے تعلیم کو من وعن جاری رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ سلطنتِ اسلامیہ ہمیشہ قائم رہے۔ اس کے بغیر ان دونوں

www.rahimia.org

طریقوں سے انسانی مسائل حل کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

ایسے حالات میں (تیسرے طریقۂ تعلیم کے مطابق) عربوں اور یمن کے علما کی اتباع کرنا ___ جیسا کہ اُس کی طرف امیر قنوجی نے دعوتِ فکر و عمل دی ہے ___ بھی ممکن نہ تھا۔ اس لیے کہ یہ طریقہ بھی ہندوستان میں پیدا ہونے والے انقلاب کے مقابلے پر ایک زیادہ بڑے انقلاب کا محتاج تھا۔ اس طریقۂ کار کے مطابق یہ ضروری تھا کہ:

(۱) ہندوستانیوں کی طبیعت، اپنے فلسفے اور تمدن کو چھوڑ کر عربوں کی طبیعت کے مطابق اُن کے فلسفے اور تمدن کو اختیار کرے۔

(۲) اور اپنی (ہندوستانی) زبان کو بدل کر اُن کی (عربی) زبان اختیار کی جائے۔

اور یہ سب کچھ کیسے ممکن تھا؟ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ گزشتہ زمانے سے ایک تسلسل کے ساتھ آنے والے تقلیدی مذاہب کو تو چھوڑ دیتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ اپنے بادشاہوں کے طریقۂ کار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور ان کی آرا کی تقلید بھی کرتے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے، کہ ''بارش سے بھاگیں اور پرنالے کے نیچے جا کر کھڑے ہو جائیں''۔

دیوبندی جماعت کے بنیادی اُصول

ایسے حالات میں مولانا محمد قاسم دیوبندیؒ نے کام کرنے کا جو طریقہ دریافت کیا، اُس کے بنیادی اصول درجِ ذیل ہیں:

1۔ ولی اللّٰہی طریقے کی اساس پر دینی فنون کی طرف دعوت دینا۔

2۔ کتاب وسنت کو تمام مسلمانوں کے طبقات میں پھیلانے کے لیے جدوجہد اور کوشش کرنا۔

3۔ قابض اور مسلط حکومت سے تعاون لیے بغیر اپنا مال اور جان خرچ کرنا۔

4۔ امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے میں تجدید کرکے ہندوستان میں دین کے غلبے کی تحریک کو نئے رُخ پر ڈالنا۔

5۔ فلسفۂ ولی اللّٰہی کے اصولوں میں انتہائی گہرا غور و خوض کرکے اُسے ہندوستان کے لوگوں کی ذہنیت کے قریب بنانا۔

6۔ ماہرینِ فلسفہ کی ''مخصوص اصطلاحات'' کو چھوڑ کر، عام ہندوستانیوں کی زبان میں بات کرنا۔

انتہائی مشکل اور نامساعد حالات میں ان اصولوں کے مطابق کام کرنا ایک آدمی کی جدوجہد اور کوشش سے نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کے لیے انسانوں کی ایک بڑی جماعت اور بیت المال کے قیام کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے امام محمد قاسم نانوتویؒ نے بنیادی اساسی اصول متعین کیے۔ نظام ترتیب دیا۔ اور امام ولی اللہ دہلویؒ کی اتباع کرنے کے لیے جماعتوں کو ایک جگہ جمع کیا اور انھیں اس کام کے لیے اُبھارا۔ یہ ہے وہ جماعت، جس کا نام ہم نے ''دیوبندی جماعت'' رکھا ہے۔

www.rahimia.org

فصل (5): مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا تجدیدی کردار

شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم دیوبندیؒ نے اپنی اکثر کتابیں خالص اُردو زبان میں لکھی ہیں۔ جن میں عام طور پر فارسی اور عربی زبان کے الفاظ استعمال نہیں کیے، حتیٰ کہ بعض اوقات وہ ''الحمد والصلوٰۃ'' بھی اردو میں لکھتے ہیں۔ چناں چہ ہندوستان میں بسنے والے لوگ ان کی کتابوں میں ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کے بعد کسی اجنبی زبان کا کوئی کلمہ نہیں پاتے۔ ان کا طرزِ خطاب، عام ولی اللّٰہی افراد سے قطعاً مختلف ہے۔ وہ اُن سے بھی اسی طرح مخاطب ہوتے ہیں، جیسا کہ وہ عیسائیوں اور ہندوؤں کے علما سے عام خطاب کرتے ہیں۔ اسی لیے اُن کے بیان کردہ بنیادی اور اساسی اصول، باقی لوگوں کے اندازِ گفتگو اور تحریرات سے مختلف ہوتے ہیں۔ حضرت نانوتویؒ کا طریقۂ کار یہ ہے کہ وہ ہر مسئلے کو بیان کرنے کے لیے پہلے اُس کے مقدمات بیان کرتے ہیں۔ پھر واضح دلائل کے ساتھ اُس کے وجدانی اُمور کی نشان دہی کرتے ہیں۔

(ولی اللّٰہی طریقے اور حضرت نانوتویؒ کے طریقے میں) ان اختلافات کے باوجود جب آپ مولانا محمد قاسم کی کتاب ''تقریر دلپذیر'' سے دین کے بنیادی اُصول اخذ کریں۔ اور پھر ''حجة الله البالغه'' کے ''باب حقیقة السعادة'' کا مطالعہ کریں تو معنی اور مفاہیم میں اُن کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پائیں گے۔

اسی طرح جب آپ (حضرت نانوتویؒ کی کتاب) ''آبِ حیات'' پڑھیں، پھر امام ولی اللہ دہلویؒ نے جو کچھ ''فیوض الحرمین'' میں لکھا ہے، اُسے پڑھیں تو آپ عجیب چیز کا مشاہدہ کریں گے۔ مثلاً امام ولی اللہ دہلویؒ کہتے ہیں کہ: ''انکشف لی کذا و کذا'' (یہ یہ بات مجھ پر منکشف ہوئی ہے۔) اور مولانا محمد قاسمؒ کہتے ہیں کہ: ''اس معاملے کے دلائل سے میرے نزدیک یہ یہ بات ثابت ہے۔''

آپ مولانا محمد قاسم کی کتاب ''مصابیح التراویح'' کے 100 صفحے کے بقدر پڑھیں اور پھر ''حجة الله البالغه'' میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس سلسلے میں جو دو سطریں لکھی ہیں، اُنھیں دیکھیں تو آپ اس رسالے کو ان دوسطروں کی شرح پائیں گے۔

اسی طرح ''قاسم العلوم'' (مکتوبات حضرت نانوتویؒ) میں ''ذبیحه'' کی بحث پڑھیے! اور پھر ''فتح العزیز'' میں اس بحث کو پڑھیے تو یوں معلوم ہوگا کہ یہ دونوں ایک ہی چراغ سے روشن الفاظ ہیں۔

ایسے ہی جب آپ (حضرت نانوتویؒ کی کتابوں) ''قاسم العلوم'' اور ''قبله نما'' میں ''تجلّی'' کی بحث پڑھیں اور پھر آپ ''عبقات'' (از حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ) پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ زیر بحث مسئلے میں دونوں ایک دوسرے کے موافق ہیں۔

فصل (6): دارالعلوم دیوبند کی شاخیں اور ان کا نظام

دیوبند میں 1282ھ (1866ء) میں دارالعلوم کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے بعد لوگوں نے اس کی شاخیں بنانے میں ان بزرگوں کی اتباع کی۔ سب سے پہلی شاخ صرف 6 مہینے بعد ''سہارن پور'' میں (مدرسہ مظاہرالعلوم) قائم ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کی تقریباً چالیس شاخیں قائم ہوگئیں۔ لیکن ان تمام کا نظام مرکزی بنیادوں پر قائم نہیں کیا گیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے حالات اور اس کے داخلی اور خارجی واقعات سال بسال ایک جلد میں روداد کی شکل میں طبع ہوتے رہے۔ ایسے ہی اس کی اکثر شاخوں کی سالانہ رودادیں بھی چھپتی رہیں۔ اور اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ 50 سالوں میں تقریباً 30 ہزار اہل علم اس نظامِ تعلیم سے فارغ ہو کر نکلے۔

''جمعیۃ الانصار'' کی تنظیم سازی کے ابتدائی زمانے میں، مَیں نے یہ چاہا تھا کہ دارالعلوم کی تمام شاخوں کو ایک مرکزی نظام میں منظّم کروں، لیکن اس طرف ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ نے بہت کم توجہ دی۔ تین سال بعد مجھے تجربات سے معلوم ہوا کہ دارالعلوم اور ان کی شاخوں کے لامرکزی نظام میں کیا حکمت تھی۔ اس لیے کہ اس طرح حکومت کا ان مدارس پر قبضہ کرنا اور اس نظام پر غالب آنا آسان نہ تھا۔ اور آزادی اور حریت کی حفاظت کرنا، اچھی اور منظّم شکل وصورت سے زیادہ مقدم ہوتا ہے۔

فصل (7): ''دیوبندی جماعت'' کا علوم کی اشاعت میں کردار

''دیوبندی جماعت'' کے اماموں نے کتبِ حدیث کی نشر و اشاعت کا کام کیا۔ چناں چہ امام بخاری کی **''الجامع الصحیح''** کو حواشی اور تعلیقات کے ساتھ، شیخ احمد علی محدث سہارن پوریؒ نے مرتب کر کے شائع کیا۔ اور اس کام میں ان کے ساتھ مولانا محمد قاسم دیوبندیؒ شریک تھے۔ اسی طرح **''صحیح امام مسلم''** شرحِ نووی کے ساتھ اور **''مؤطا امام مالکؒ''** اور اس کے حواشی، **''جامع ترمذی''** اور اس کے حواشی، **''سنن نسائی''** اور **''سنن ابن ماجہ''** اور ان کے ساتھ شاہ عبدالغنی دہلویؒ کی تعلیقات، اور **''سنن ابی داؤد''** ہمارے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کی تصحیح کے ساتھ، **''مشکوۃ المصابیح''** اور اس کی تعلیقات، **''تفسیر بیضاوی''** اور اس کی تعلیقات، **''احیائے علوم الدین''** اور **''مجمع البحار''** مولانا محمد یعقوب دیوبندیؒ کی تصحیح کے ساتھ، اور **''تقریب التھذیب''** اور **''المغنی''** مولانا احمد علی محدث سہارن پوریؒ کی تصحیح کے ساتھ، **''حجۃ اللہ البالغہ''** اور **''إزالۃ الخفا''** مولانا محمد احسن نانوتویؒ کی تصحیح کے ساتھ، اور محمد قاسم فرشتہ کی **''تاریخ فرشتہ''** مولانا محمد یعقوب دیوبندیؒ کی تصحیح کے ساتھ شائع ہوئیں۔ اور ہندوستان کے اطراف کے بہت سے اہل علم نے ان کی اتباع کی۔

www.rahimia.org

فصل (8): علوم کے تراجم اور شروحات میں ''دیوبندی جماعت'' کا کردار

دیوبندی جماعت کے اماموں نے اردو زبان میں کافی کتابوں کے ترجمے اور شروحات لکھیں۔ چناں چہ شیخ قطب الدین دہلویؒ نے ''مشکوٰۃ'' کی شرح (إظهار الحق) لکھی۔ اور اس میں ''مشکوٰۃ'' کا ترجمہ صدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلویؒ کا ہے۔ مولانا خرم علی نے ''مشارق الأنوار'' کی شرح لکھی۔ ''درّالمختار'' کی شرح مولانا محمد احسن نانوتویؒ نے لکھی۔ جب کہ انھوں نے ''احیاء العلوم'' اور ''کیمیائے سعادت'' کا ترجمہ بھی کیا۔ مولانا محمد یعقوب دیوبندیؒ نے ''منہاج العابدین'' کا ترجمہ کیا۔ اور ''القول الجمیل'' کا ترجمہ شیخ خرم علی بلہوری نے کیا۔ پس لوگوں نے ان حضرات کی اتباع کی۔ اور اب تک دین کے فنون میں سے کوئی فن ایسا نہیں اور اماموں کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں، جس کا اردو زبان میں ترجمہ نہ ہو چکا ہو۔

فصل (9): ''دیوبندی جماعت'' کے مختلف درجات

دارالعلوم دیوبند اور اس کی شاخوں سے علم حاصل کر کے فارغ ہونے والے تمام لوگ ایک درجے پر نہیں ہیں۔ بلکہ آپ ان کے درمیان کئی طبقات پائیں گے۔ اور ان کے آپس میں چند درجات ہیں:

پہلا طبقہ: اس میں وہ لوگ شامل ہیں، جو امام ولی اللہ دہلویؒ کی وصیت پر پوری استقامت کے ساتھ قائم ہیں۔ اور امام محمد قاسم دیوبندیؒ نے طرزِ تفکر میں جو کچھ تجدید کی تھی اور اسلام کے دشمنوں کا ردّ کرنے کے لیے جو تجدیدی کردار ادا کیا تھا، اسے پورے طور پر قبول کرتے ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''القول الجمیل'' میں لکھتے ہیں کہ:

''میں حق کے طالب کو چند اُمور کی وصیت کرتا ہوں:

1۔ مال داروں کی صحبت ہرگز نہ اختیار کی جائے۔ سوائے اس کے کہ لوگوں سے ظلم دور کرنے، یا اُن کو عام لوگوں کی بھلائی کے کاموں پر اُبھارنے کے لیے اُن سے ملا جائے۔

یہی وہ طریقہ ہے، کہ جس کے ذریعے سے ''بادشاہوں کی صحبت کی مذمت کرنے والی احادیث'' اور ''بہت سے نیک لوگوں اور علما کے بادشاہوں سے ملنے کے عمل'' کے درمیان تطبیق دی جاسکتی ہے۔

2۔ جاہل صوفیوں کی صحبت اختیار نہ کی جائے۔ اور نہ جاہل عبادت گزاروں کی، اور نہ تنگ نظر اور جمود اختیار کرنے والے فقہا کی، اور نہ محدثین میں سے ظاہرِ حدیث پر عمل کرنے والوں کی، اور نہ غالی قسم کے عقلیت پسند اور متکلمین کی۔

بلکہ طالبِ حق کو چاہیے کہ:

(ا) عالم بنے۔

www.rahimia.org

(ب) ایسا صوفی بنے، جو دنیا سے بے رغبتی رکھتا ہو۔

(ج) اللہ کی طرف ایسی مستقل توجہ رکھنے والا بنے کہ ''بلند حالات'' کے رنگ میں رنگا ہوا ہو۔

(د) سنتِ رسول اللہؐ میں رغبت رکھنے والا بنے۔

(ہ) رسول اللہؐ کی حدیث اور آثارِ صحابہؓ کی اتباع کرنے والا بنے۔

(و) احادیث کی شرح و بیان کے لیے ایسے محققین فقہا کے کلام کی تلاش میں رہے، جو نظر و فکر میں حدیث کی طرف مائل ہوں۔

(ز) ایسے اصحاب کی اتباع کرنے والا بنے، جو سنت سے اپنے عقائد ماخوذ کرتے ہوں۔ اور اس باب میں عقلی دلیل کو محض تبرعاً اپنے پیش نظر رکھتے ہوں۔

(ح) ایسے اصحابِ سلوک کی اتباع کرنے والا بنے، جو علم و تصوف کے جامع ہوں۔ اپنے اوپر تشدد کرنے والے نہ ہوں۔ اور سنتِ رسول اللہؐ سے زائد، دقیق باتوں میں نہ اُلجھیں۔

ان اوصاف سے متصف ہونے والے لوگوں کے علاوہ اور کسی کی صحبت مت اختیار کریں۔

3۔ فقہا کے مذاہب میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی بات نہ کی جائے۔ بلکہ مجموعی طور پر تمام فقہا کو اجمالی طور پر قبول کرنا چاہیے۔ اور ان میں سے اُس مسلک کی اتباع کرنی چاہیے، جو صریح سنت اور مشہور حدیث کے موافق ہو۔ اور اگر دونوں مذاہب کی دونوں باتیں صریح سنت سے نکلتی ہوں تو اُس کی اتباع کی جائے، جدھر اہل علم کی اکثریت ہو۔ اور اگر علما کی تعداد بھی برابر ہو، پھر اختیار ہے۔ (جس کی چاہو، اتباع کرو) بہرحال بغیر کسی تعصب کے، تمام مذاہب کو ایک ہی سمجھنا چاہیے۔

4۔ صوفیا کے مختلف سلاسل میں بھی کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جائے۔ مغلوب الحال صوفیا پر تنقید نہ کیا جائے۔ اور نہ اُن لوگوں پر، جو سماع وغیرہ سننے کے بارے میں تاویل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی صرف اس کی اتباع کی جائے، جو سنت سے ثابت شدہ ہے۔ اور محققین راسخین میں سے اصحابِ علم کے راستے پر چلنا چاہیے''۔ واللہ الموفق والمعین۔ إنتھیٰ (38)

دوسرا طبقہ: دوسرے طبقے کے وہ لوگ ہیں، جو ایسے مسائل میں محققانہ طرزِ فکر و عمل رکھتے ہیں، جن کا تعلق شرک و بدعات کے ردّ کرنے سے ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے منہج اور طریقۂ کار کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اور یہ لوگ جمعہ اور جماعات کی پوری پابندی کرتے ہیں۔ تدریس و تعلیم کے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ وعظ و نصیحت اور ادب و آداب سکھاتے ہیں۔ فتویٰ نویسی کا کام کرتے ہیں۔ جھگڑوں کے فیصلے نمٹاتے ہیں۔ طبیب بھی ہیں اور دوستی بھی نبھاتے ہیں۔ ایسے لوگ فقہ کو حدیث کے ساتھ تطبیق دیتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں وہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے طریقے پر عمل کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ تمام مذاہبِ فقہیہ پر مذہبِ حنفی

www.rahimia.org

کی مدد ونصرت کرتے ہیں۔ انھیں توجیہات وتاویلات میں اجتہادی ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ اس دعوے کے ساتھ کہ وہ صریح سنت پرعمل کر رہے ہیں۔ اس طبقے کے لوگ کثرت سے ہیں۔

ان میں سے ایک جماعت نے ترقی کی تو وہ طبقۂ اولیٰ کے ساتھ شامل ہوگئی۔ ایسے حضرات مذہبِ حنفی کی نصرت کرنے کی کوشش، اُس وقت کرتے ہیں، جب کہ اُس پر ہونے والی تنقید اور تشنیع کو دفع کرنا مقصود ہو۔ اور وہ اسی تک محدود رہتے ہیں۔ ایسے حضرات بستیوں اور شہروں میں عام لوگوں کی اصلاح میں مشغول رہتے ہیں۔

تیسرا طبقہ: یہ طبقہ وہ ہے، جس نے دیوبندی جماعت کی کچھ چیزیں لے لیں۔ اور کچھ چھوڑ دیں۔ ان لوگوں نے ولی اللّٰہی جماعت کے علاوہ دیگر لوگوں سے، جو تعلیم حاصل کی تھی، اُسی پر باقی رہے۔

لیکن ایسے تمام وہ لوگ:

(۱) جنھوں نے شرک وبدعات کے اعمال کا ارتکاب کیا۔ اور اس پر انھیں کوئی ندامت اور شرمندگی نہیں۔

(۲) اسی طرح وہ لوگ، جنھوں نے ہمارے شہروں کے غالی حنفیوں کی طرح آئمہ محدثین کے خلاف گفتگو کی۔

(۳) وہ لوگ جنھوں نے آئمہ فقہا کے خلاف بات کی اور ان کی شان میں بے ادبی کی۔

ایسے تمام لوگوں کو دیوبندیوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

میرے نزدیک ''دیوبندی جماعت'' کے تمام کام تین بنیادی اُمور پر مشتمل ہیں:

1۔ جمہور انسانوں کی تعلیم وتربیت۔

2۔ جمہور انسانوں کی حکومت قائم کرنے کے لیے جدوجہد اور کوشش۔

3۔ مہذب اور صالح قوموں کے اجتماع کے ساتھ اپنے آپ کو ملانے کی جدوجہد اور کوشش۔

واللّٰہ أعلم۔ (اور اللہ زیادہ جانتا ہے۔)

فصل (10): باصلاحیت افراد کی قلت کے دور میں شیخ الہندؒ کا تجدیدی کردار

پہلے اور اونچے طبقے کے لوگ اگرچہ ہمیشہ تھوڑے ہی رہے، اُس حدیث کے مصداق، جیسا کہ حضورؐ نے فرمایا تھا: "إنما الناس کالابل المائة لاتکاد تجد راحلة" (39) ''لوگوں کی مثال اُن 100 اونٹوں کی سی ہے، کہ جن میں بسااوقات ایک بھی سواری کے قابل نہیں ہوتا۔'' لیکن ان کی قلت 1297ھ (1880ء) کے بعد دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ کیوں کہ اس سال یا اس کے قریب قریب ''دیوبندی جماعت'' کے رہنما اور ان کے بزرگ، جیسا کہ ہمارے استاذ (حضرت شیخ الہندؒ) کے استاذ مولانا محمد قاسمؒ (نانوتوی) مولانا احمد علی سہارن پوریؒ، مولانا عبدالغنی دہلویؒ وفات پاگئے۔ اور مولانا محمد یعقوب دیوبندیؒ اور مولانا محمد مظہر سہارن پوریؒ (نانوتوی) 1302ھ (1885ء) میں وفات پاگئے۔ چناں چہ مشائخ کی صحبت اختیار کرکے نفع اُٹھانے والوں کی تعداد کم ہوگئی۔ اور معاملہ محض کتابیں

www.rahimia.org

پڑھنے اور قواعد وضوابط کی پابندی اختیار کرنے تک محدود ہو کر رہ گیا۔

شیخ الہندؒ کے بنیادی کام

پھر ہمارے شیخ، شیخ الہندؒ نے مدرسے (دارالعلوم دیوبند) کا نظام سنبھالنے کی کوشش کی، تاکہ دارالعلوم سے فارغ ہونے والوں میں سے باصلاحیت افراد کثرت سے پیدا ہوں۔ چناں چہ انھوں نے سب سے پہلے دیوبندی علما میں سے ایسے لوگوں کو جمع کیا، جو مختلف فنون میں متبحر عالم دین کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اور ان کو تعلیم و تربیت کے اُمور میں وسیع تجربہ حاصل تھا۔ اور ان کو دارالعلوم دیوبند میں قیام کا حکم دیا۔

اس طرح آپؒ نے:

(۱) ایسے ''درجۂ تکمیل'' کی بنیاد رکھی، جس میں ولی اللّٰہی طریقے پر سرسری طور پر تعلیم دینے کے بجائے مستقل طور پر تعلیم دی جائے۔ اس کے لیے آپؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کا درس شروع کیا۔

(۲) آپؒ نے اس پر توجہ دی کہ امام ولی اللہ دہلویؒ کے طریقے پر اردو زبان میں اللہ کے کلام کے معانی اور مفاہیم کی وضاحت کی جائے۔ چناں چہ آپ نے شیخ عبدالقادر دہلویؒ کے ترجمہ قرآن کی اصلاح کی۔ اور اس کے تفسیری حواشی لکھنا شروع کیے۔

(۳) اسی طرح آپؒ نے ''دارالحدیث'' کی بنیاد رکھی۔ تاکہ فنونِ حدیث کی تکمیل کو مستقل مقصد بنا کر دارالعلوم کے علما کی ایک جماعت تیار کی جائے۔

(۴) آپؒ نے یہ بھی ارادہ کیا کہ امام ربانی کے طریقے میں تجدید کی جائے۔ تاکہ تصوف اور علم کے جامع علما تیار ہوں۔ اور پھر اس جماعت کے ذریعے سے غیر مسلم ممالک میں اسلام کی اشاعت کی جائے۔

(۵) آپؒ کا یہ بھی ارادہ تھا کہ وہ شیخین: مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ اور حکیم الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے طریقے کو دوبارہ زندہ کریں، تاکہ دینی سیاست کا فہم و شعور رکھنے والے علما تیار ہوں۔

''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کی بنیاد اور ''جمعیت علمائے ہند'' کی تشکیل

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے شیخ، شیخ الہندؒ نے ''جامعہ ملیہ اسلامیہ'' کی بنیاد رکھی تھی۔ اور ''جمعیۃ علمائے ہند'' کی تشکیل کی تھی۔ اس تناظر میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ ہی ہندوستان میں بسنے والے لوگوں کے لیے ایک مکمل نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

رحمه الله و رفعه الیٰ أعلیٰ علیین و بارک فی المسلمین بتکثیر امثاله.

(اللہ ان پر رحم کرے اور انھیں اعلیٰ علیین میں بلند مرتبہ عطا فرمائے۔

اور مسلمانوں میں اُن جیسے لوگوں کے بکثرت پیدا ہونے کی برکت عطا فرمائے۔) آمین۔

www.rahimia.org

حوالہ جات وحواشی

1۔ اردو خود نوشت میں حضرت سندھیؒ لکھتے ہیں: ''(مکہ مکرمہ میں) میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا تھا۔ میں نے حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہاں میں کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کروں گا۔ اُس نے مجھے نیشنلسٹ تسلیم کرلیا۔ اس وجہ سے ایک طرح میں محفوظ ہوگیا۔ خطبات ومقالات، ص227، طبع لاہور۔

2۔ دیکھیے! کتاب الہند از البیرونی، ص64، طبع دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد دکن (انڈیا)

3۔ تمہید کے اصل نسخے میں یہ عبارت اغلاط سے پُر ہے۔ اس سے صحیح مفہوم سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اس کی تصحیح کے لیے قوسین میں استاذ محترم مولانا غلام مصطفی قاسمیؒ نے ''کتاب الہند'' کی اصل عبارت سے نقل کرکے جملے بڑھائے ہیں۔ اصل کتاب کے لیے دیکھیے! کتاب ''تحقیق مافی الہند'' از البیرونی، ص64، طبع دائرۃ المعارف عثمانیہ، حیدرآباد دکن (انڈیا)

4۔ آزاد، بلگرامی، کتاب ''مآثر الکرام''، ص7، طبع مفید عام، آگرہ (انڈیا) 1910ء۔

5۔ آزاد، بلگرامی، کتاب ''سبحة المرجان فی آثارِ ہندوستان''، ص25، انٹرنیٹ ایڈیشن۔

6۔ ایضاً، ص30۔

7۔ دہلویؒ، مفتی ذکاءاللہ، تاریخ ہندوستان، ج1، ص244، طبع شمس المطابع، دہلی (انڈیا) 1897ء۔

8۔ ابن تیمیہ، شیخ الاسلام، منہاج السنہ، ص272، جلد6، مکتبہ شاملہ۔

9. مواهب الجليل فی مختصر للشيخ خليل، باب ترجمة مالک، ص82، مكتبه شامله.

10۔ المسوّٰی من اَحادیث المؤطا، از امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ص63، جلد اول، طبع بیروت۔

11۔ الحطہ فی ذکر الصحاح الستۃ، نواب صدیق حسن قنوجی، بھوپالیؒ، ص289، طبع بیروت۔

12۔ ایضاً ص406۔

13۔ ابجد العلوم، نواب صدیق حسن قنوجی بھوپالی، ص123، جلد3، طبع مکتبہ قدوسیہ، لاہور، 1983ء۔

14۔ لکھنوی، ابوالحسنات، عبدالحئی، التعلیق المجد علی مؤطا الامام محمدؒ، ص25، طبع کراچی، 1961ء۔

15۔ تفہیماتِ الٰہیہ، جلد2، ص245، طبع المجلس العلمی، ڈھابیل (انڈیا) ومجموعہ وصایا اربعہ، ص50، طبع شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد

16۔ شوکانی، محمد بن علی بن محمد، نیل الاوطار، شرح منتقی الاخبار، جلد1، ص50، طبع دارالاحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، 1999ء

17. هدية الشيعه، از مولانا محمدقاسم نانوتویؒ، ص256، طبع حقانيه، کراچی.

18۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، الفصل الثانی، ص36، جلد1، طبع مجتبائی، دہلی۔

19۔ حجۃ اللہ البالغہ، ص404 تا 417، طبع دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

20۔ بوارق المعرفہ، مشمولہ انفاس العارفین، ص84، مطبوعہ مطبع احمدی، متعلق مدرسہ عزیزی، دہلی، 1897ء۔

21۔ الجزء اللطیف، مشمولہ انفاس العارفین، ص194، مطبوعہ مطبع احمدی، متعلق مدرسہ عزیزی، دہلی، 1897ء۔

22۔ بخاری، کتاب الاذان، باب وجوب القراءۃ للامام، حدیث نمبر 756، ص158، طبع بیروت۔

23۔ بوارق المعرفہ، مشمولہ انفاس العارفین، ص69، مطبوعہ مطبع احمدی، متعلق مدرسہ عزیزی، دہلی، 1897ء۔

24۔ الجزء اللطیف، مشمولہ انفاس العارفین، ص195، مطبوعہ مطبع احمدی، متعلق مدرسہ عزیزی، دہلی، 1897ء۔

25. القول الجميل فی بيان سواء السبيل، ص211، فصل 11، طبع مكتبه رحمانيه، لاهور.

26. انفاسِ رحيميه (مکتوبات امام عبدالرحيم دهلویؒ) ص27، طبع مجتبائی، دهلی 1333ھ / 1915ء.

www.rahimia.org

27۔ بوارق المعرفہ، مشمولہ انفاس العارفین، ص 82، مطبوعہ مطبع احمدی، متعلق مدرسہ عزیزی، دہلی، 1897ء۔

28۔ الجزء اللطیف، مشمولہ انفاس العارفین، ص 196، مطبوعہ مطبع احمدی، متعلق مدرسہ عزیزی، دہلی، 1897ء۔

29۔ دیکھیے! فتاویٰ عزیزی، جلد اول، ص 16-17، طبع در مطبع مجتبائی، دہلی، 1341ھ۔

30۔ مولانا سندھیؒ ''شاہ ولی اللہؒ اور ان کی سیاسی تحریک، استدراک و تصحیح'' میں لکھتے ہیں:

''امام ولی اللہ دہلویؒ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہند کے مسلمانوں سے اپنی حکومت قائم کرنے کی طاقت، اس وقت افاغنہ کی طرف منتقل ہوچکی ہے۔ (دیکھیے ''الخیر الکثیر'') ہم جانتے ہیں کہ افاغنہ (پشتو بولنے والے) بھی ہندوستانی اقوام میں سے ایک قوم ہیں، جس میں ایرانی، ترکی، اسرائیلی، عربی قبائل مخلوط ہوچکے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اسی غرض سے امام عبدالعزیز دہلویؒ اپنی انقلابی پارٹی کو افغانوں سے ملانا ضروری سمجھتے ہیں۔ امام عبدالعزیزؒ کے آخری کاموں کا مرکز الامیر الشہید اور مولانا عبدالحئیؒ اور مولانا محمد اسماعیل کا اجتماع تھا۔ ان کے لیے افغانستان کی ہجرت کا فیصلہ امام عبدالعزیز نے کیا تھا۔ اگرچہ عمل اُن کی وفات کے بعد شروع ہوا۔ ہمیں معلوم ہے کہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روحانی طور پر معلوم ہوا تھا کہ: ''افغانوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔'' خطبات و مقالات، ص 405، طبع لاہور۔

31۔ مولانا غلام رسول مہر نے ''جماعت مجاہدین'' میں لکھا ہے کہ:

''مولوی محمد حسن موصوف رام پور منہاراں کے رہنے والے تھے۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ اور مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ سے علم کی تکمیل کی۔ دورانِ جہاد میں انتہائی سادگی سے زندگی گزاری۔ یہاں تک کہ اپنے لیے سونے کی بھی کوئی خاص جگہ مقرر نہ کی۔ سید صاحبؒ کی باتیں سننے کے شوق میں پاس بیٹھے رہتے۔ نیند آتی تو وہیں زمین پر سو جاتے۔ شاہ اسماعیل کے بعد لشکرِ اسلام میں عجز، حلم، خاکساری اور قابلیت کے لحاظ سے مولوی محمد حسن جیسا کوئی نہ تھا۔'' دیکھیے! جماعتِ مجاہدین، ص 279، طبع کتاب منزل، لاہور۔

32۔ حضرت گنگوہیؒ کے اس بیان کا حوالہ ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ ممکن ہے کہ یہ بات خود حضرت گنگوہیؒ سے مولانا سندھیؒ نے دورانِ سبق سنی ہو۔

33۔ الحیات بعد الممات، سوانح میاں نذیر حسین محدث دہلوی، مؤلفہ فضل حسین بہاری، ص 123، طبع مکتبہ اثریہ، شیخوپورہ، 1984ء۔

34. التاج المکلل، از نواب صدیق حسن بھوپالی، ص 179-180، طبع شرف الدین الکتبی و اولادہٗ.

35۔ مولانا غلام رسول مہرؒ نے ''سرگزشتِ مجاہدین'' میں لکھا ہے کہ: ''آپ (میاں نذیر حسین دہلوی) کو گرفتار کرکے دہلی سے راولپنڈی لے گئے، اور وہاں کم و بیش ایک سال جیل خانے میں نظر بند رکھا۔ دو آدمی ساتھ تھے۔ ایک میر عبدالغنی، ساکن سورج گڑھ، جو بڑے عابد و زاہد بزرگ تھے۔ انھوں نے جیل خانے میں ہی وفات پائی۔ دوسرے صاحب عطاء اللہ تھے، جنھوں نے اس زمانے میں پوری صحیح بخاری سبقاً سبقاً پڑھی۔ اور قرآن مجید بھی حفظ کرلیا۔ میاں صاحب نے سرکاری لائبریری سے کتابیں منگوانے کی اجازت لے لی تھی، اور ان کا بیش تر وقت مطالعے میں گزرتا تھا۔'' ''سرگزشتِ مجاہدین''، جلد 4، ص 402، طبع لاہور۔ مزید دیکھیے! سوانح میاں نذیر حسین دہلوی، الحیات بعد الممات، ص 82، طبع مکتبہ اثریہ، شیخوپورہ، 1984ء۔

36۔ کمالاتِ امدادیہ در قصص الاکابر لحصص الاصاغر، مرتب: مولانا اشرف علی تھانویؒ، ص 75، طبع ملتان۔

37۔ یہ قول غالباً حضرت سندھیؒ نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے براہِ راست سنا ہے۔

38۔ القول الجمیل فی بیان سواء السبیل، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، ص 193-198، عربی/اردو، طبع مکتبہ رحمانیہ، لاہور

39. الجامع الصحیح البخاری، حدیث 6498، ص 1321، طبع بیروت.

www.rahimia.org

تاریخ و سیاسیات

تحریکِ خلافت

پروفیسر ڈاکٹر محمد عبد المقیت شاکر علیمی

برصغیر پاک و ہند کی سرزمین، وہ مبارک سرزمین ہے، جس پر اوّل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مبارک قدم آئے۔ کتبِ تواریخ سے ثابت ہے کہ کم و بیش 23 صحابہؓ یہاں وارد ہوئے۔ خلیفہ راشد حضرت عمرؓ کے زمانے سے ہی یہاں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس سرزمین پر اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ ساحلی علاقے، مکران، سندران (سنجان)، طوران کے علاوہ منصورہ اور ملتان میں اسلامی شان و شوکت، محبت و مؤدت اور اَخلاق پر مبنی معاشرت کے نقوش نظر آنے لگے۔ توحید کی روشنی نے کفر و ضلالت کے تاریک پردوں کو چاک کر ڈالا۔ قرآن و سنت کی تعلیم عام ہوئی۔ علما و محدثین نے حلقہ ہائے درس قائم کیے۔ ہر طرف امن و امان کی فضا قائم ہوئی۔ اور پورا علاقہ اسلامی خلافت کے تحت عالمِ اسلام کا ایک قانونی حصہ بن گیا۔ یہی مسلمانوں کی ابتدائی چار سو سالہ جدوجہد تھی، جس کا دائرہ سندھ و ملتان تک تھا۔

بعد میں برّی راستوں سے آنے والے سرداروں نے پورے برصغیر پر اپنی حکومت قائم کی۔ اور محمود غزنوی سے لے کر مغلیہ سلطنت تک مسلمانوں نے برصغیر پر ایک ہزار سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ انھوں نے اس خطۂ ارضی کو اپنے تدبر، ذہانت و فطانت اور قائدانہ صلاحیتوں سے ایسا استحکام بخشا کہ تاتاری جیسے خونی بھیڑیوں کو، جنھوں نے دنیا کے بیشتر علاقے تہس نہس کر ڈالے تھے، ہندوستان کی طرف بڑھنا تو کجا، اس طرف دیکھنے تک کی جرأت نہ ہو سکی۔ اور یہ علاقہ صدیوں تہذیب و تمدن اور علم و فن کا مرکز بنا رہا۔ دُور دُور سے اہلِ کمال یہاں آ آ کر جمع ہوئے۔ سلاطین وقت نے ان کی قدر افزائی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ چناں چہ آج بھی ان کی علمی و فنی یادگاریں اس خطۂ جنت نظیر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن ''ہر کمالے را زوالے'' کے مصداق یہ سلطنت بھی بالآخر زوال پذیر ہوئی۔ اس کے جو کچھ اسباب تھے، وہ نہ صرف تاریخ کے طالب علم، بلکہ عام آدمی سے بھی پوشیدہ نہیں ہیں۔

مغلیہ سلطنت میں اورنگ زیب عالم گیرؒ نے سندھ سے لے کر راس کماری اور افغانستان تک بڑے طویل عرصے حکومت کی۔ اس بالغ نظری، تدبر، چاق و چوبند اور محتاط ذہن کی کرشمہ سامانی تھی کہ کوئی بڑا فتنہ نہیں اُٹھا۔ اور سلطنت حسبِ سابق امن و سلامتی سے چلتی رہی۔ لیکن 1707ء میں اس کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت زوال پر

آمادہ ہونے لگی۔ مختلف فتنوں نے سر اُبھارا۔ ایک طرف سکھ، مرہٹے اور جاٹوں نے شورش برپا کی تو دوسری طرف انگریزوں نے، جو بغرضِ تجارت یہاں آئے تھے، مختلف علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ دراصل جب حکمران کمزور، ناعاقبت اندیش اور فہم و فراست سے عاری ہوں، عیش کوشی، آرام طلبی کی طرف مائل ہوں تو معاشرہ بھی انحطاط پذیر ہونے لگتا ہے۔ اس میں بہت سی اخلاقی و معاشرتی برائیاں راہ پانے لگتی ہیں۔ سلطنت بد نظمی اور طوائف الملوکی کا شکار ہونے لگتی ہے۔ نتیجتاً سلطنت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ ایسے میں جو تحریکیں اُٹھتی ہیں، ناکام ہو جاتی ہیں۔

اورنگ زیب عالم گیرؒ کے بعد 1707ء سے 1857ء تک ڈیڑھ سو سال کا عرصہ ایسا ہے کہ ایک ہزار سال سے قائم مستحکم و مضبوط سلطنت کلی طور پر تباہ و برباد ہو گئی۔ اس دوران بہت سے اسلام کے فرزند اور وطن پرست اُبھر کر سامنے آئے۔ انھوں نے ہندوستان کی اسلامی سلطنت کو سہارا دینے کی کوشش کی، مگر اپنے ہی ننگِ قوم اور ننگِ وطن افراد کی غداری کے سبب ناکام ہوئے۔ ان میں نواب سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ علما نے اصلاحِ معاشرہ کی طرف توجہ دی۔ چناں چہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے اس ضمن میں بڑی کوششیں کیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف رہے۔ اور عدل و انصاف پر مبنی حکومت کے قیام کی جدوجہد میں آخر الذکر دونوں بزرگوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ انگریز کے شاطرانہ ذہن نے یہاں کی مسلم اور غیر مسلم قوتوں کے درمیان تفرقہ پیدا کیا۔ اور لالچی و خود غرض سردار و خوانین کو اپنے ساتھ ملا کر مسلمانوں کی ہر جدوجہد کو ناکام بنا دیا۔ اور پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ مسلم آبادی پر ظلم و بربریت کا ایسا بازار گرم کیا کہ چنگیز و ہلاکو جیسے ظالموں کے واقعات قصۂ پارینہ بن کر رہ گئے۔

مگر مسلمان، جس کی رگوں میں شہادت کی عظمت بیٹھی ہوئی تھی، ہر خطرے کو بالائے طاق رکھ کر غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ تاکہ اللہ کے قانون اور شریعتِ محمدیہؐ کے سائے میں زندگی گزار سکے۔ وہ جانتا تھا کہ قوموں کی زندگی میں اُتار چڑھاؤ آتے ہی رہتے ہیں۔ تاریخ کے آئینے میں اس نے ایسے نشیب و فراز بہت دیکھے تھے۔ وقتی شکست و ناکامی کو اس نے دائمی نہیں سمجھا۔ اور مایوس ہو کر اپنے آپ کو طوفانِ حوادث کے تھپیڑے سہنے کے لیے نہیں چھوڑ دیا۔ اس کے مذہب میں مایوسی کفر ہے۔ چناں چہ اس نے انگریز اور غیر مسلم قوتوں کے خلاف اپنی جدوجہد برقرار رکھی۔ اب جدوجہد کا رُخ دوسرا تھا۔ اب جنگ و جدال سے زیادہ حسن تدبیر سے کام لے کر اپنے سیاسی اقتدار کو بچانا تھا، جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے پامال کر ڈالا تھا۔ اور جس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی سماجی اور اقتصادی زندگی کو زبردست نقصان پہنچا تھا۔ اسلامی معاشرت کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ اور مغرب کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی اسی کوشش کی ابتدا تھی، لیکن مسلمان اپنا سیاسی اقتدار بچانے میں ناکام ہوئے۔ اس کے بعد برصغیر میں آزادی کی تحریکیں بڑے زور و شور سے چلیں۔

www.rahimia.org

اس سلسلے میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ خاص ہیں۔ حاجی صاحب حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے شاگرد تھے۔ اور حضرت شاہ صاحب ہی کے شاگرد اور داماد حضرت نصیر الدینؒ سے اول بیعت ہوئے۔ یہ وہی بزرگ ہیں، جنھوں نے حادثۂ بالاکوٹ کے بعد تحریکِ جہاد میں ایک نئی روح پھونکی تھی۔ اس کے بعد حاجی صاحب سید احمد شہیدؒ کے ایک اور خلیفہ میاں جیو حضرت نور محمد جھنجھانویؒ سے بیعت ہوئے۔ گویا آپ کی تربیت ایسے ہی بزرگوں کے زیرِ اثر ہوئی، جو تحریکِ آزادی سے وابستہ تھے۔ آپؒ نے 1857ء کی جنگِ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قصبہ تھانہ بھون کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دیوانی اور فوج داری مقدمات شریعت کے مطابق فیصل کرتے۔ اس میں ان کے فیض یافتگان مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ معاون و مددگار رہے۔ بدقسمتی تھی کہ ان کی کوششیں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکیں۔ اور انگریز کام یاب رہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ زخمی ہوگئے۔ مولانا رشید احمد گنگوہی چھ ماہ قید رہے۔ حافظ محمد ضامنؒ اور مولانا احمد اللہ مدراسیؒ شہید ہوگئے۔ اور حضرت حاجی صاحب مکہ مکرمہ ہجرت کر گئے۔ ان حالات میں کوئی بھی تحریک کام یاب نہیں ہوسکتی تھی۔ اب اکابرینِ ملت کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ صحیح اسلامی فکر اور خطے کی آزادی کا کس طرح تحفظ کیا جائے، جس کے لیے وہ کم و بیش ایک صدی سے کوشاں رہے ہیں۔ چناں چہ 30 مئی 1867ء کو فکرِ ولی اللّٰہی کے تحت ''دارالعلوم دیوبند'' کا قیام عمل میں آیا۔

اس میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ان کے رفقائے کار شامل رہے ہیں۔ بہ ظاہر علومِ اسلامی کی درس گاہ تھی۔ اور اس حیثیت سے بہت ممتاز بھی ہوئی، مگر یہ درس گاہ محض قرآن و حدیث کی تدریس اور علومِ اسلامی کے تحفظ کے لیے ہی نہ تھی، بلکہ اس کا مقصد آزادئ ضمیر کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق بھی تھا۔ اور 1857ء میں ناکامی کی تلافی کرنا بھی تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ اس کی یوں وضاحت فرماتے ہیں:

> ''حضرت الاستاذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس مدرسے کو محض درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کے لیے قائم نہیں کیا تھا۔ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں 1857ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیرِ اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ 1857ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔'' (1)

یہ مقصد حضرت شاہ ولی اللہؒ کی انقلابی فکر کا ہی پرتو ہے۔ اسی صدا کی بازگشت ہے، جو حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ان کے رُفقا نے میدانِ جہاد میں جان کا نذرانہ پیش کر کے لگائی تھی۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا شاہ محمود امروٹیؒ، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ، حضرت مولانا محمد صادق کھڈہ والےؒ، حضرت مفتی کفایت اللہؒ او حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے علاوہ دیگر علما نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں بیش از بیش حصہ لیا۔ ہر طرح کی ہزیمت اُٹھائی۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ خدامِ کعبہ کی تحریک ہو کہ ریشمی رومال کی تحریک، ترکِ

موالات کی تحریک ہو کہ تحریکِ خلافت ہو۔ ہر ایک میں ہر طرح کی جانی و مالی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ گویا دیوبند ایک تحریک کا نام ہے، جس سے وابستگان نے احیائے اسلام اور آزادیٔ وحریت کی جدوجہد کا عظیم الشان کام لیا۔ یہ ایسی تربیت گاہ ثابت ہوئی، جس نے اسلام کے جاں نثاروں اور ملت کے غم گساروں کی ایک جماعت تیار کی، جس نے اسلام کی سربلندی اور مسلمہ اُمہ کے وقار کی بحالی کے لیے سردھڑ کی بازی لگائی۔ مسلمانوں میں پیدا شدہ تعطل و جمود کو توڑا۔ سحرزدہ قوم کو جھنجھوڑ کر عام بیداری پیدا کی۔ تحریکِ خلافت بھی ایسی ہی ایک تحریک تھی، جس کا مقصد احیائے اسلام کی کوششوں کو تیز کرنا۔ قومی آزادی، سامراج مخالف جدوجہد، ذہنی بیداری، استحصالی نظاموں کے خلاف شعور، مظلوم اقوام کے لیے عدل وانصاف کی فراہمی، مذہبی رواداری اور قومی ہم آہنگی کے لیے جدوجہد کرنا تھا۔

منصبِ خلافت

تیرھویں صدی عیسوی یعنی 1288ء میں ایشیائے کوچک میں دولتِ سلجوقیہ کے خاتمے کے ساتھ ہی سلطنتِ عثمانیہ کا سورج چمکا۔ تاتاریوں کی غارت گری نے جب بنوعباس کی سلطنت کو برباد کردیا۔ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو کچھ ترکی قبائل ایشیائے کوچک کی طرف رُخ کر گئے۔ انھوں نے وہاں اپنی سلطنت قائم کرلی۔ اور فتوحات کرکے سرویا، بوسنیا، بلغاریہ، ہنگری، یونان، قسطنطنیہ، غرض یورپ کے اکثر علاقے ایران، شام، عراق اور مصر وغیرہ کو سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کرلیا۔ بلاشبہ سلاطین عثمانیہ نے اپنے تدبر، اولوالعزمی اور انتظامی لیاقت وقابلیت کی بدولت سلطنت کو بہت وسعت دی اور مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔ جب 1516ء میں سلطان سلیم اول نے مصر فتح کیا اور والیٔ حجاز نے برضا ورغبت سلطان سلیم کی اطاعت قبول کرلی تو آخری عباسی خلیفہ ''محمد الملقب بہ متوکل علی اللہ ثالث''، سلطان سلیم کے حق میں منصبِ خلافت سے دست بردار ہوگیا۔ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات، علم، تلوار، ردائے مبارک اور حرمین شریفین کی کنجیاں سلطان کے حوالے کردیں، جو خاندانِ خلافت میں بطورِ خلافت نشانی چلے آرہے تھے۔ اب خلافت قریش سے نکل کر عثمانی خاندان میں چلی آئی۔ اس وقت سے عثمانی سلطنت سلاطین عالم اسلام میں خلیفہ تصور کیے جانے لگے۔ مساجد میں امیرالمؤمنین کی حیثیت سے ان کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے سلطان نے اپنے آپ کو مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کا ذمہ دار سمجھا۔ اور مسلمانوں کے دشمنوں سے جہاد کو فرض اولین جانا، حدودِ سلطنت کی وسعت وحفاظت کے ساتھ ساتھ رعایا کی فلاح و بہبود اور ان کے حقوق کی پاسبانی کو اپنا فریضہ سمجھا۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے خلفائے عباسی کے مقابلے میں اسلام کی بڑی خدمت کی۔ اور مسلم ممالک میں سلاطین عثمانیہ بڑی عزت وتوقیر کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔

یورپ میں بیداری اور ترکی کا زوال

1788ء میں فرانس میں انقلاب آیا۔ اس نے پورے یورپ میں ہلچل مچادی۔ مادی ترقی کی رفتار تیز ہوئی۔

www.rahimia.org

اقتصادی حالات میں تغیر آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سرمایہ دار طبقہ برسر اقتدار آیا۔ اور متوسط طبقہ اشترا کی نظریات کا حامی ہو کر اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں نظر آنے لگا۔ سائنسی نظریات کو فروغ ہوا۔ اُن کی عملی شکلیں سامنے آنے لگیں۔ اس تغیر و تبدل سے افکار و خیالات میں بھی تبدیلی آئی۔ مقاصدِ حیات بدلے۔ انسانی تہذیب نے اپنا الگ راستہ اختیار کیا۔ اب پرانا نظامِ حیات فرسودہ معلوم ہونے لگا۔ اسی لیے جلدی ہی دم توڑنے لگا۔ اس کے مقابلے میں قومیت، جمہوریت اور آزادیٔ فکر کے جدید نظریات پھیلنے لگے۔ اور سب سے پہلے یورپ کی مسلمان ریاستوں پر اس نے اپنا اثر دکھایا۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر یورپ کی مسیحی برادری متحد ہو کر ترکی کے چنگل سے نکلنے کی کوششیں کرنے لگی۔ چناں چہ 1825ء میں سربیا اور ڈینیوب ریاستیں متحد ہو کر خود مختار ہو گئیں۔ 1878ء میں معاہدۂ برلن کی رو سے بوسنیا ہرزے گوینا کو آسٹریا اور ہنگری کو دے دیا گیا۔ رومانیہ، مونٹی نیگرو کو آزاد کر دیا گیا۔ قارص اور باطوم، روس کو مل گئے۔ بلغاریہ میں سیلف گورنمنٹ قائم ہو گئی۔ اگر چہ وہ برائے نام ترکی کی ماتحتی میں رہی۔ 1881ء میں فرانس نے تیونس اور انگریزوں نے مصر پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ 1891ء میں جلاوطن ترکوں نے ''انجمن اتحادِ ترقی'' کی بنیاد رکھی۔ جن کے افکار و خیالات میں مغرب کے جدید نظریات کی جھلک نمایاں تھی۔ جس نے غیر مسلم انقلابی انجمنوں اور یہودیوں سے اتحاد کر لیا تھا۔ 12-1911ء میں جنگ طرابلس و بلقان میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ بلقانی ریاستیں آزاد ہو گئیں۔ اور ترکی سمٹ کر مشرقی تھریس تک محدود ہو کر رہ گیا۔ (2) بیسویں صدی کے رُبع اول میں جنگ عظیم شروع ہوئی۔ 1914ء سے 1918ء تک اور بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ شام و عراق، نجد و حجاز اور دوسری عرب ریاستیں فرانس اور برطانیہ کے زیر انتظام آ گئیں۔ یہ وہ حالات تھے، جو دنیا میں رونما ہو رہے تھے۔ اور ان سے عالمِ اسلام خصوصاً سلطنتِ عثمانیہ براہِ راست متأثر ہو رہی تھی۔ گویا مغربی طاقتوں نے مسلمانوں پر دو طرف سے بیک وقت حملہ کیا۔ ایک طرف اپنی استعماری قوت سے اور دوسری طرف نظریات کی سرحدوں سے۔ اور یہ حملہ ایسا بھرپور تھا کہ پھر مسلمانوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔

اس دو سو سال کے عرصے میں عالمِ اسلام میں بہت سی تحریکیں رونما ہوئیں۔ خصوصاً جمال الدین افغانیؒ، شیخ محمد عبدہؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی تحریکیں ایسی تھیں، جو مسلمانوں کی اجتماعی اصلاح اور سیاسی احیا میں ممد ثابت ہو سکتی تھیں، مگر چالاک قوموں نے کام یاب نہیں ہونے دیا۔ البتہ بعض علاقائی تحریکیں بھی اُٹھیں، جنھوں نے اپنے اپنے علاقے کے مخصوص حالات کے پیش نظر مسائل کے حل کی کوششیں کیں۔ ان میں مدحت پاشا اور فواد پاشا نے ترکی میں، خیر الدین پاشا نے تیونس میں، امیر عبدالقادر نے الجیریا میں، مفتی عالم جان نے روس میں، مصطفیٰ کمال نے مصر میں، شیخ نجم ہادی نجم آبادی نے ایران میں اور سر سید احمد خان نے ہندوستان میں۔ یہ تحریکیں اگر چہ خاصی اہمیت کی حامل ہیں تاہم ان سے براہِ راست عالمِ اسلام میں انقلاب برپا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے یورپی طاقتوں کو ان سے کچھ ڈر نہ تھا۔ چناں چہ انھوں نے انھیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا، بلکہ بعض مقامات پر بوجوہ امداد و اعانت کی۔ لیکن ان

تحریکوں سے ایک بات ضرور ہوئی کہ سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ اور آزادی کا تصور اُبھرا۔

ہندوستان میں عام بیداری

ہندوستان میں آزادی کی تحریک تو بہت پہلے شروع ہو چکی تھی، جس کا اجمالی خاکہ ہم ابتدا میں پیش کر چکے ہیں، لیکن عام سیاسی بیداری کا زمانہ 13-1911ء کا ہے، جب طرابلس و بلقان کی جنگیں ہوئیں۔ سامراجی طاقتوں نے گھناؤنی سازشوں کا جال پھیلا کر خلافتِ اسلامیہ کو ختم کرنے کی کوششیں کیں۔ اس وقت اربابِ فکر و نظر بہت بے چین ہوئے۔ انھیں فکر لاحق ہوئی کہ اگر مغرب کا بڑھتا ہوا سیلاب نہ رُکا تو ہندوستان کی طرح رہا سہا عالمِ اسلام بھی شکنجے میں آجائے گا۔ اور پھر مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت ممکن نہیں رہے گی، جس کی ذمہ داری از روئے شرع مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ انھیں محسوس ہونے لگا تھا کہ گویا ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں کا آغاز ہوگیا ہے۔ اسی زمانے میں مسجد کانپور کا انہدام کا واقعہ پیش آیا۔ ہر سطح پر اس کی مذمت کی گئی۔ مولانا محمد علی جوہرؒ، وزیر حسن سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کو لے کر انگلستان گئے۔ وہاں انھوں نے زبردست پروپیگنڈہ کیا۔ اور بالآخر ان کی کوششیں کام یاب ہوئیں۔ ادھر طرابلس کی جنگ میں شاہِ اطالیہ یہ کہہ چکا تھا کہ ہم کعبے کو بھی دیکھ لیں گے۔ چناں چہ مولانا صبغت اللہ شہید فرنگی نے ایک موقع پر ان الفاظ میں اس کا اظہار کیا ہے:

> (اس پر مسلمان مجاہدانہ سر پر کفن باندھ کر نکل آئے اور پورے ہندوستان میں) ''اٹلی کے طرابلس الغرب پر حملے کے بعد ہندی دردمندانِ اسلام کو اس لیے بھی خانہ کعبہ کی حفاظت کی زیادہ فکر پیدا ہوئی تھی کہ عمانویل شاہ اطالیہ نے ایک موقع پر یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے ہوائی جہاز مسلمانوں کے کعبے سے بھی نمٹ سکتے ہیں۔'' (3)

یہ حالات و واقعات تھے، جن کی بنا پر اکابرینِ ملت سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ کس طرح مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔ ترکی سے جو اُمیدیں تھیں، وہ ختم ہوگئی تھیں۔ وہ تو خود اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس کو تو خود امداد و اعانت کی ضرورت تھی۔ ایسے میں ہندوستان میں بیک وقت کئی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ایک طرف مولانا محمد علی جوہرؒ کی کوششوں سے ایک طبی وفد ترتیب دے کر ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ترکی روانہ کیا گیا۔ دوسری طرف ترکوں کی مالی امداد کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع ہوئی۔ دارالعلوم میں انجمن ہلالِ احمر کی شاخ قائم کی۔ اور ایک لاکھ روپیہ جمع کر کے استنبول پہنچایا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں:

> ''بلقان کے خوں خوار اور طرابلس کے سنگین واقعے نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے دل و دماغ پر نہایت عجیب مگر بے چین کن اثر ڈالا۔ چناں چہ اس وقت حسبِ طریقہ استاذِ اکبر حضرت مولانا محمد قاسم (نانوتویؒ)، حضرت مولانا (شیخ الہندؒ) نے پوری جان توڑ کوشش امدادِ اسلام میں فرمائی۔ فتاویٰ

چھپوائے۔ مدرسہ دیو بند بند کر دیا۔ طلبا کے وفود بھیجے۔ خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے۔ چندے دیے۔ اور ہر طرح کی مدد کی۔'' (4)

مولانا عبیداللہ سندھیؒ رقم طراز ہیں:

''دارالعلوم دیو بند کا فتویٰ (جو گزشتہ ''القاسم'' میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں) اب تک مختلف طور پر ایک لاکھ سے زیادہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ دارالعلوم اور اس کے متعلق مدارس کے مدرسین اور طلبا کے وفود قصبات اور دیہاتِ ہند کے اطراف میں دورہ کر کے رؤسا، مشائخ اور عوام کو متوجہ کرتے رہے ہیں۔ محض ان لوگوں کے مواعظ اور اس جماعت کی جدوجہد سے ایک بڑی مقدار، جس کا تخمینہ تین لاکھ روپیہ سے کم نہیں، مقامی انجمنوں اور اخبارات کے ذریعے ترکوں کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اراکین دارالعلوم کی معرفت بھی پچھتر ہزار سے زیادہ جمع ہو چکا ہے۔ اور یہ روپیہ عموماً نیشنل بینک کے توسط سے پریذیڈنٹ ہلالِ احمر قسطنطنیہ کے نام سے پہنچایا گیا۔

یہاں اس قدر ذکر بے محل نہ ہوگا کہ ضلع سہارن پور میں مولانا خلیل احمد صاحب، صدر انجمن ہلالِ احمر سہارن پور، حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری و مولانا اشرف علی تھانوی و مولانا مسعود احمد گنگوہی و مولانا حکیم محمد احمد رام پوری کے مساعی جمیلہ سے جس قدر روپیہ جمع ہوا، غربا و متوسط الحال لوگوں سے اتنی رقوم جمع کر لینا آسان نہیں۔'' (5)

اسی طرح مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے دل میں ایک ایسی انجمن کے قیام کا خیال آیا، جو ناموسِ کعبہ کی حفاظت میں اپنی جان و مال کی قربانی سے بھی دریغ نہ کرے۔ چناں چہ فرنگی محل میں مسلمان زُعما کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ اور 6 مئی 1913ء کو ''انجمن خدامِ کعبہ'' کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کے صدر مولانا عبدالباری فرنگی محلی ہوئے۔ مشیر حسین قدوائی، مولانا شوکت علی معتمد مقرر ہوئے۔ اور حکیم عبدالولی، ڈاکٹر ناظر حسین اور مولانا محمد علی اراکین مجلس قرار پائے۔ ''خدامِ کعبہ'' کے نام سے ایک رسالے کا اجرا ہوا، جو تحریک کا ترجمان تھا۔ اس انجمن کی پورے ملک میں خوب تشہیر کی گئی۔ مولانا جوہرؒ نے ''ہمدرد'' کی اشاعتوں میں اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور لوگوں کو انجمن میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔

دریں اثنا 1914ء میں عالم گیر جنگ شروع ہوگئی۔ ایک فریق جرمنی اور آسٹریا پر مشتمل تھا تو دوسرا برطانیہ، فرانس، روس اور سرویا پر۔ ابتدا میں ترکی غیر جانب دار رہا، لیکن برطانیہ کے معاندانہ رویوں کی وجہ سے مجبور ہوکر اسے مجبوراً جنگ میں شامل ہونا پڑا۔ اور خلیفۃ المسلمین نے اعلانِ جہاد کر دیا۔ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ ادھر برطانیہ نے اس جنگ میں ہندوستان کی فوج کو استعمال کیا۔ دراصل اس کی سب سے بڑی طاقت ہندوستان کی فوج تھی۔ اس کے لیے ہندوستان ہی سب سے بڑا سرمایہ تھا۔ اور سب سے بڑا مرکز تھا۔ جہاں وہ جب چاہے، جہاں چاہے

فوجیوں کی بڑی تعداد بھیج سکتا تھا۔ اور جتنا چاہے اس ملک کا سرمایہ خرچ کرسکتا تھا۔ جنگِ عظیم میں برطانیہ کی کامیابیاں اس بات کی شاہد و عادل ہیں۔ یہ بات اربابِ بصیرت اور اکابرین ملت کے لیے بڑی تشویش کی تھی۔ انگریز مسلمان فوجیوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کر کے عالم اسلام کو نہ صرف کمزور، بلکہ صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اسلام کی سب سے بڑی طاقت خلافتِ عثمانیہ کو محدود کرنے میں کوشاں ہے۔ چناں چہ ایک طرف علمائے دیوبند نے اپنی جہاد کی تحریک کو عملی شکل دینے کی کوشش کی اور سرحدی علاقے کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنایا۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ''ریشمی رومال'' کی تحریک شروع کی۔ منظرعام پر اگرچہ حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے، لیکن پس منظر میں حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ بھی تھے، جن سے حضرت شیخ الہندؒ مشورہ کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اس تحریک میں بڑے سرگرم رہے۔ (6)

دوسری طرف مولانا محمد علی جوہرؒ نے ''ہمدرد'' اور کامریڈ میں، مولانا ظفر علی خاںؒ نے ''زمیندار'' میں اور مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ''الہلال'' وغیرہ میں بہت سے مضامین لکھے۔ جن سے انگریز کی شاطرانہ چالیں بے نقاب ہوئیں۔ مسلمانوں میں ترکوں کے لیے ہمدردانہ جذبات پیدا ہوئے۔ اور خلافتِ اسلامیہ کو مغربی استعمار کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تدابیر اختیار کی گئیں۔ یہ عام بیداری تھی، جو جنگِ طرابلس سے شروع ہوئی۔ اور جنگِ عظیم کے خاتمے تک اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اور اسی کا نتیجہ تحریکِ خلافت کی صورت میں برآمد ہوا۔

تحریکِ خلافت

ترکی کا جنگِ عظیم میں شامل ہونا، خلیفۃ المسلمین کا اعلانِ جہاد کرنا ہر مسلمان کے لیے لمحۂ فکریہ تھا، کیوں کہ اسلام نے منصبِ خلافت اور خلیفۃ المسلمین سے متعلق بہت سی ذمہ داریاں اس پر عائد کی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اس پر ''مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب'' میں تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کا اجمالی خلاصہ یہ ہے:

- ☆ خلیفۂ اسلام یا کسی بھی اسلامی حکومت پر غیر مسلم حملہ آور ہوں یا ان کی آزادی کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوں تو ہر مسلمان پر ان کی مدد کرنا اور حملہ آور سے لڑنا فرضِ عین ہوجاتا ہے۔
- ☆ خلیفۂ اسلام ہو یا کوئی اور مسلمان، جب اس کی کسی غیر مسلم سے لڑائی ہوجائے تو شرعاً غیر مسلم کا ساتھی ہوکر مسلمانوں سے نہیں لڑسکتا۔ اگر لڑے گا تو اسلام سے خارج ہوجائے گا۔ اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔
- ☆ اگر صورت جہاد کی نہ ہو تو مسلمانوں پر شرعی طور پر ''ترک'' و ''اختیار'' کا فرض عائد ہوتا ہوجائے گا۔ یعنی غیر مسلموں سے تعلقات ترک کر دینا اور وسائل اختیار کر کے دفاع کرنا۔ (7)

ان مذہبی اور شرعی ذمہ داریوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ عالم اسلام کا بچہ بچہ خلیفۃ المسلمین کے اعلانِ جہاد کے ساتھ

www.rahimia.org

ہی میدانِ جہاد میں نکل کھڑا ہوتا، لیکن جب 2 نومبر 1914ء کو برطانیہ نے ترکی کے خلاف جنگ کی تو اس کے ساتھ ہندوستان بھر میں مندرجہ ذیل اعلان بھی مشتہر کیا:

☆ ترکی کے ساتھ ہماری جنگ دفاعی ہے۔ ہم نے دو ماہ تک ہر قسم کی مخالفت برداشت کی۔ اور کوشش کی کہ کسی طرح جنگ نہ ہو، لیکن ترکی مسلسل حملے کرتا رہا۔ اب مجبوراً ہم کو بھی اعلانِ جنگ کرنا پڑا۔ اس لیے ہماری جنگ حملہ آور کی نہیں ہے۔

☆ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہم پر بھروسا رکھنا چاہیے کہ اس جنگ میں ہمارے یا ہمارے ساتھیوں کی جانب سے کوئی بات ایسی نہ ہوگی، جو ان کے مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچائے۔ اسلام کے تمام مقاماتِ مقدسہ محفوظ رہیں گے، جن میں عراق بھی شامل ہے۔ ان کے احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔

☆ اسلام کے مقدس مقامِ خلافت کے خلاف کوئی کاروائی عمل میں نہ آئے گی۔ ہماری جنگ موجودہ ترکی وزارت سے ہے، جو جرمنی کے زیر اثر کام کر رہی ہے۔ خلیفۃ المسلمین سے اور اسلام سے نہیں ہے۔ گورنمنٹ برطانیہ نہ صرف اپنی جانب سے بلکہ اپنے تمام حلیفوں کی جانب سے اس کی ذمہ داری لیتی ہے۔

اس اعلان کی بڑے پیمانے پر تشہیر کردی گئی۔ یہاں تک کہ کوئی مسلمان گھرانہ شاید ہی ایسا ہو، جو اس اعلان سے بے خبر رہا ہو۔ اور یہ اعلان نہ صرف ہندوستان میں بلکہ مصر اور سوڈان وغیرہ میں بھی مشتہر کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی حکومتِ برطانیہ کے سرکردہ لوگ وقتاً فوقتاً اسی قسم کے بیانات دیتے رہے۔ مقصد یہ تھا کہ خلیفۃ المسلمین کا اعلانِ جہاد بے اثر ہوجائے۔ چناں چہ نتیجہ بھی یہی نکلا کہ برصغیر پاک ہند کے مسلمانوں پر صورتِ حال مشتبہ ہوگئی:

☆ نادان اور حیلہ جو علما نے یہ سمجھا کہ ترکی حملہ آور ہے۔ اس لیے شرعاً صورت دفاع کی نہیں، بلکہ حملہ و ہجوم کی ہے۔ اور اس میں مسلمانوں کی شرکت فرضِ کفایہ کا حکم رکھتی ہے نہ کی فرض عین کی۔ اس لیے شرعاً ضروری نہیں کہ مسلمانانِ ہند اس میں حصہ لیں۔

☆ عام مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ حکومتِ برطانیہ اپنا بچاؤ کر رہی ہے۔ اس کا مقصد اسلامی ممالک پر قبضہ کرنا یا خلافت کو نقصان پہنچانا نہیں ہے۔

☆ مقاماتِ مقدسہ، بیت المقدس و حرمین وغیرہ ہر حال میں محفوظ رہیں گے۔ برطانوی حکومت اور اس کے حلیفوں نے اس کا وعدہ بھی کیا ہے۔

مسلمانانِ ہند کی یہ مشتبہ فکر اور متذبذب ذہن عالمِ اسلام کی ہلاکت و بربادی کا باعث بنا۔ اگر اس وقت مسلمان برطانوی پروپیگنڈے میں نہ آتے، ذرا بھی غور و فکر سے کام لیتے، تاریخ کے صفحات پر ثبت استعماری طاقتوں کے مسلمانوں کے ساتھ رویوں کا جائزہ لیتے تو ان کے وعدوں کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی اور وہ ایسی غلطی کا ارتکاب نہ کرتے، جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوئی۔

www.rahimia.org

بقول قاضی محمد عدیل:

''یہ سحر طرازیاں اتنی جادوگری تو کر ہی رہی تھیں کہ خلیفۃ المسلمین کے اعلانِ جہاد سے جو جوش و خروش پیدا ہونے والا تھا، وہ مدہم پڑ گیا۔ مسلمان سپاہی اور فوجی افسران مارچ کو گئے، جن کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ ہندوستان میں صرف دس ہزار فوج رہ گئی۔'' (8)

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بڑے دُکھ کے ساتھ کہا:

''نہایت افسوس اور روسیاہی کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کا نہ یہ مذہبی فیصلہ صحیح تھا نہ وعدوں اور اعلان پر اعتماد۔ انھوں نے اپنی سیزدہ صد سالہ تاریخِ حیات میں شاید ہی کوئی ایسی قومی و مذہبی غلطی کی ہوگی، جیسی اس موقع پر کی۔ اور جس کے نتائج کی یہ پہلی قسط آج ان کے سامنے ہے۔ وماتخفی صدورھم أکبر". (اور جوان کے سینے میں ہے، وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔) (9)

جنگِ عظیم چار سال سے زائد عرصے تک ہوتی رہی۔ مسلمان جنگ کے نتائج سے مطمئن بیٹھے رہے۔ ان کا روپیہ، ان کی جانیں، ان کے ملک کی تمام قوتیں اسلامی حکومت و خلافت کے مٹانے میں صرف کی جاتی رہیں۔ مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی بھی ہوئی، مگر برصغیر کے مسلمان برطانیہ کے وفادار رہے۔ اور اس کے وعدوں پر اعتماد کرتے رہے۔ اتحادی فوجیں پیش قدمی کرتی رہیں۔ بالآخر 30 اکتوبر 1918ء کو ترکی نے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اتحادیوں نے سابقہ معاہدوں اور وعدوں کو بالائے طاق رکھ کر 10 اگست 1919ء کو ''سیورے'' کے مقام پر ترکی کو نہایت ذلیل شرائط پر صلح کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ جو معاہدہ سیورے کہلایا۔ مولانا آزادؒ نے برطانوی حکومت کے وعدوں اور صلح نامے پر ''مسئلہ خلافت'' میں کس قدر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے! (10) اس کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ برطانیہ نے 26 نومبر 1914ء کو بصرہ پر قبضہ کیا۔

2۔ 22 نومبر 1915ء کو عراق کی مشہور زیارت گاہ ''سلمان پاک'' پر حملہ کیا، جہاں حضرت سلمان فارسیؓ کا مزار ہے۔

3۔ مارچ 1917 کو بغداد پر قبضہ کیا، جو مشہور زیارت گاہ ہے۔

4۔ 9 نومبر 1917ء کو بیت المقدس میں برطانوی فوجیں داخل ہوئیں۔ اور اس پر انگریزوں نے قبضہ کیا۔

5۔ 5 جون 1919ء کو سرزمین حجاز میں سازش کی گئی۔ شریفِ مکہ سے بغاوت کرائی گئی۔ دارالامن (حرمِ مکہ) میں کشت و خون کا بازار گرم ہوا۔ اور حدودِ حرم میں گولہ باری ہوئی۔

6۔ میجر راس کے ہوائی جہاز نے عین مدینہ منورہ پر پرواز کی۔

7۔ کوفہ، کربلائے معلیٰ، نجف اشرف پر قبضہ کیا۔

8۔ ترکی کو ''تھریس'' کے کل علاقے سے محروم کر دیا گیا، جہاں مسلمانوں کی بہت زیادہ آبادی تھی۔

www.rahmia.org

9۔ صلح نامے کی رو سے ترکی سے اس کے دارالسلطنت کی فرماں روائی اور خود مختاری سلب کر لی گئی۔ اور طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔

10۔ سمرنا جیسے زرخیز مقام کو ترکی سے الگ کر دیا گیا۔ یونان نے مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ اور بے شمار مسلمان ہلاک کر دیے گئے۔

11۔ ترکی کو ایشیائے کوچک کے مالی اور فوجی اختیارات کی خود مختاری سے محروم کر دیا گیا۔ اس کی حیثیت ایک ماتحت ریاست کی رہ گئی۔

12۔ شام کو ترکی سے الگ کر کے فرانس اور عراق کو برطانیہ کی حکم برادری میں دے دیا گیا۔

13۔ صلح نامے کی رو سے سلطان المعظم کے وہ تمام دینی اور اسلامی اختیارات سلب کر لیے گئے، جو بحیثیت خلیفۃ المسلمین انھیں حاصل تھے۔ اور جن کے بعد خلافت کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔

14۔ ترکی کے دارالخلافہ پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت ایک نظر بند کی سی ہو گئی۔

یہ تھیں صلح نامۂ ترکی کی شرائط اور استعماری قوتوں کی وعدہ خلافیاں، جن سے اصل حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ چناں چہ اس کی ہر طرف سے مذمت ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہرؒ اس صلح نامے کے بارے میں کہتے ہیں:

''اس کی مالی دفعات کو دیکھیے! ہندوستان میں کسی چھوٹی سی چھوٹی ریاست کو بھی اپنے مالیے پر اتنی بے اختیاری نہ ہو گی، جیسی اس عہد نامے نے ترکوں کے لیے تجویز کی ہے۔ جہاں پہلے ترکی میں سات لاکھ فوج رہتی تھی، وہاں اب صرف 10 ہزار باقاعدہ 35 ہزار امدادی فوج کی اجازت دی گئی ہے۔ اور اس کے افسر و تربیت دہندہ بھی سب باہر کے لوگ ہوں گے۔ ترکی کی بحری قوت کو بالکل ہی محدود کر دیا گیا ہے۔ صرف چند چھوٹے چھوٹے جہاز اور کشتیوں کی اجازت دی گئی ہے۔ اور ہوائی جہاز تو ترکی تجارتی اغراض کے لیے بھی نہیں بنا سکتا۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ اتحادیوں بلکہ یونانی ہوائی جہاز بھی ترکی میں جہاں چاہیں گشت لگائیں۔ اور ترکی پر یہ پابندی کہ وہ ان کے لیے پٹرول اور رسد وغیرہ مہیا کرے۔ اس پر غداروں اور عیاروں نے دستخط کر دیے۔'' (11)

اب ذرا غور کیجیے کہ مسلمانوں پر اسلامی قوانین کی رو سے جو ذمہ داریاں عائد تھیں، وہ انھوں نے پوری نہیں کیں۔ انگریزوں کے وعدوں پر اعتماد کرتے ہوئے خلیفۃ المسلمین کے مقابلے میں برطانوی افواج کے دوش بدوش برسرِ پیکار رہے۔ اور انھیں کی بدولت اتحادیوں نے ان علاقوں پر اپنی حکومت یا پھر عمل داری قائم کی، جو مسلمانوں کے قبضے میں تھے۔ یہ سب حالات تھے، جن کی روشنی میں اکابرین ملت نے ابتدائے جنگِ عظیم سے ہی اپنی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ مختلف علاقوں میں خلافت کمیٹیاں قائم ہو گئی تھیں۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی ہی تحریک کے محرک اور سربرآوردہ رہنما تھے۔ چناں چہ لکھنؤ، دہلی، بمبئی، پنجاب، رنگون اور دوسرے علاقوں میں خلافت کمیٹیاں قائم ہو چکی

www.rahmia.org

تھیں۔ دہلی خلافت کمیٹی کے صدر حکیم اجمل خاں تھے۔ پنجاب کمیٹی کے سیکرٹری مولانا داؤد غزنوی تھے۔ لکھنؤ خلافت کمیٹی کے صدر بیرسٹر ممتاز حسین تھے۔ اور بمبئ خلافت کمیٹی کے صدر سیٹھ محمد جان چھوٹانی تھے۔ ان کمیٹیوں کے اجلاس منعقد ہوتے اور دوسری علاقائی کمیٹیوں کے سربراہوں میں باہم صلاح و مشورہ ہوتا۔ اس طرح گویا جنگِ عظیم کے دوران ہی تحریکِ خلافت کا آغاز ہو گیا تھا۔

پہلی خلافت کانفرنس

بمبئ خلافت کمیٹی کا اجلاس 11 نومبر 1919ء کو منعقد ہوا۔ اس میں مرکزی خلافت کمیٹی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اور بمبئ کی خلافت کمیٹی کو مرکزی خلافت کمیٹی کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ بعد میں 23 اور 24 نومبر کو یہ کانفرنس فضل حق کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس میں ملک کے مختلف حصوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اور ہندو زعما بھی اس میں شریک ہوئے۔ ان میں گاندھی جی، سوامی شردھانند، ڈاکٹر ساورکر، پنڈت کشن کانت مالوہ، مسٹر موہن جی، مسٹر شنکر لال وغیرہ تھے۔ یہ گویا پہلی مرکزی خلافت کانفرنس تھی۔ اس میں یہ فیصلہ سنایا گیا کہ:

1۔ حکومت کی طرف سے منائے جانے والے جشن صلح یا جشن فتح کا مقاطعہ کرنا اور اس میں کسی بھی قسم سے حصہ نہ لینا۔
2۔ ترکی کے لیے منصفانہ اور آبرومندانہ امن کا حصول۔
3۔ مسٹر لارڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ کی 5 جون 1918ء کی تقریر کے مطابق ترکی سلطنت کی سلامتی سے متعلق عمل درآمد کی کوششیں۔
4۔ جب تک حکومت مسلمانوں کے احساسات کے مطابق خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت اور غیر مسلموں کے اثرات سے ان کے تحفظ کا فیصلہ نہیں کرتی، اس وقت تک اس سے تعاون نہیں کیا جائے گا۔
5۔ ان مقاصد کے حصول اور خلافت کے آبرومندانہ تصفیے کے لیے برطانیہ اور ہو سکے تو امریکہ وفد بھیجنا۔

یہ مقاصد تھے، جو پہلی خلافت کانفرنس میں متعین ہوئے۔ اور اپنے مقاصد کے مطابق صوبائی خلافت کمیٹیاں سرگرمِ عمل ہو گئیں۔ اس اجلاس میں حکیم اجمل خان، فضل حق اور سید حسین پر مشتمل سب کمیٹی کا قیام بھی عمل میں آیا، جس کے ذمے عدمِ تعاون کے اثرات کا جائزہ لینا تھا اور اپنی تجاویز پیش کرنا تھیں۔ گویا یہاں سے عملی اقدام کا بھی آغاز ہو گیا۔

دوسری خلافت کانفرنس

دوسری خلافت کانفرنس امرتسر میں 30 دسمبر 1919ء کو منعقد ہوئی۔ اس موقع پر وہاں کے مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس بھی ہو رہے تھے۔ علی برادران اس وقت جیل میں تھے۔ 28 دسمبر کو وہ جیل سے رہا ہو کر سیدھے

www.rahimia.org

امرتسر پہنچے۔ اور تینوں جماعتوں کے اجلاسوں میں شرکت کی۔ خلافت کانفرنس میں مولانا شوکت علی نے صدارتی خطبہ دیا۔ اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ ایک وفد مولانا محمد علی کی سرکردگی میں انگلستان بھیجا جائے۔ اور ایک وفد وائسرائے ہند سے ملاقات کے لیے ترتیب دیا گیا کہ وہ وائسرائے کو اپنے مطالبات پیش کرے اور تائید حاصل کرے۔ اس کے بعد 4-5 جنوری 1920ء کو حیدر آباد سندھ میں خلافت کانفرنس ہوئی۔ مقررین نے حکومت کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کا اظہار کیا۔ برطانیہ کو مسلمانوں کا بدترین دشمن قرار دیا۔ ترکی کے مسئلے کے حل اور مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ نہ کرنے کی صورت میں جہاد کا عزم کیا۔ اب گویا مسلمانوں میں زیادہ جوش وخروش پیدا ہوگیا۔ جو اس کے بعد ہونے والی متعدد کانفرنسوں میں مزید بڑھتا رہا۔

وائسرائے ہند سے وفد کی ملاقات اور لائحہ عمل

امرتسر کانفرنس میں وائسرائے ہند سے ملاقات کا جو فیصلہ ہوا تھا، اس کے مطابق ایک وفد 19 جنوری 1920ء کو لارڈ چیمس فورڈ وائسرائے ہند اور گورنر جنرل سے ملا۔ ایک یادداشت پیش کی، جس پر ملک کے پچیس سیاسی سرکردہ افراد کے دستخط تھے۔ ان میں مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، علی برادرانؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، حکیم اجمل خانؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، ڈاکٹر انصاریؒ، مولانا سید سلمان ندویؒ، مولانا عبدالماجد بدایونیؒ وغیرہ کے علاوہ مہاتما گاندھی، سوامی شردھانند، پنڈت رام بھیج دت چودھری وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ پنڈت مدن موہن مالوہ، پنڈت موتی لال نہرو، راجہ صاحب محمود آباد، قائداعظم محمد علی جناح، راجہ تصدق رسول صاحب اور مسٹر فضل حق وغیرہ نے تار کے ذریعے مسلمانوں کے مطالبات کی تائید میں اپنے احساسات سے وائسرائے کو مطلع کیا۔

لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا، بلکہ وائسرائے نے حکومتِ برطانیہ کی پالیسی کو معقول قرار دیا۔ جنگ کے نتیجے میں جو کچھ ترکی کے ساتھ ہوا، اسے ترکی حکومت کی غلط پالیسی کا ردِعمل قرار دیا۔ مسلمانانِ ہند کی بے چینی کو بے بنیاد بتلایا۔ اور کوئی عملی اقدام کرنے سے معذوری ظاہر کردی۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ اگر کوئی وفد برطانوی حکومت کے سامنے مسلمانانِ ہند کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے لندن بھیجا جائے تو وہ ضروری سہولتیں فراہم کریں گے۔ بقول قاضی عدیل عباسی:

> ''یہ پہلا دھکا تھا، جو مسلمانوں کو لگا۔ اور جو اُمیدیں حکومتِ برطانیہ کی وفادار مسلم رعایا نے ہزایکسیلنسی حضور وائسرائے دام اقبالہ کی ذات بابرکات سے وابستہ تھیں، وہ سب خاک میں مل گئیں۔''(13)

غرض وائسرائے کے جواب سے بہت مایوسی ہوئی۔ اب اکابرین کو قوم کے سامنے ایک لائحہ عمل پیش کرنا تھا۔ چناں چہ 20 جنوری 1920ء کو اس پر غور کرنے کے لیے ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں گاندھی جی نے عدمِ تعاون کا

پروگرام پیش کیا۔ یاد رہے کہ پہلی خلافت کانفرنس منعقدہ بمبئی میں یہ فیصلہ کیا جاچکا تھا کہ مطالبات نہ مانے جانے کی صورت میں عدمِ تعاون کی تحریک چلائی جائے گی۔ چناں چہ گاندھی جی نے درج ذیل تجاویز پیش کیں:

1۔ تمام سرکاری خطابات واپس کر دیے جائیں۔

2۔ عدالتوں کا مقاطعہ کیا جائے۔

3۔ سرکاری اسکولوں اور حکومت کی امداد سے چلنے والے تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے۔

4۔ سرکاری ملازمتوں سے استعفے دے دیے جائیں۔

5۔ نئی قانون ساز جماعت جو تشکیل پانے والی ہے، اس میں کسی بھی قسم کا حصہ نہ لیا جائے۔

یہ تجاویز ایسی تھیں کہ ابتدا میں سوائے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے دوسرے زعما کو اس سے فی الفور اتفاق کرنے میں تردد ہوا۔ مگر جلد ہی تمام حضرات گاندھی جی کی اس تجویز سے متفق ہوگئے۔ اور میرٹھ میں خلافت کمیٹی کے جلسے میں ترکِ موالات کی تجویز منظور کی گئی۔ لیکن عملی طور پر یکم اگست سے ترکِ موالات کی تحریک شروع کرنے پر اتفاق ہوگیا۔

وفدِ خلافت

مولانا محمد علی جوہرؒ کی سرکردگی میں ایک وفد انگلستان بھیجے جانے کا اصولی فیصلہ تو امرتسر خلافت کانفرنس میں ہو چکا تھا۔ اور اب مولانا کی سرکردگی میں ابوالقاسم، مولانا سید سلیمان ندوی، سید حسن (14) اور حسن محمد حیات (15) پر مشتمل ایک وفد یکم فروری 1920ء کو انگلستان روانہ ہوا۔ 22 فروری کو وینس کی بندرگاہ پر پہنچا۔ وہاں اخبارات کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ صلح کانفرنس سے چند ہی دنوں میں ترکی کا فیصلہ ہوجائے گا۔ چناں چہ وفد نے وہیں سے وزیر اعظم برطانیہ لائڈ جارج اور وزیر ہند مسٹر مانٹیگو کو تار دیے کہ ترکی کا فیصلہ کرنے سے پہلے انھیں اظہارِ خیال کا موقع دیا جائے۔ اس کے علاوہ اتحادیوں کی ساری حکومتوں اور ان کے اخبارات کو بھی تار بھیجے۔ اس کے بعد وفد لندن پہنچا۔ وہاں ان کے ساتھ عبدالرحمٰن صدیقی اور شعیب بخاری جو آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، ساتھ ہوگئے۔ شیخ مشیر حسین قدوائی بھی وفد سے مل گئے۔ وفد نے مختلف جلسوں میں اپنے مؤقف کی وضاحت کی۔ اور جب مسٹر لائڈ جارج سے ملے تو محمد علی جوہرؒ نے نہایت آزادی و بے باکی سے مسلمانوں کے مطالبات پیش کیے۔ حکومت کے وعدے یاد دلائے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے خلیفہ اور خلافت کے منصب اور اس کی اہمیت کو واضح کیا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

17 مارچ کو وزیر اعظم کی طرف سے انھیں مطلع کر دیا گیا کہ:

> ''ترکی کے ساتھ انھیں اصولوں کے مطابق معاملہ کیا جائے گا، جن کے مطابق دوسرے ممالک سے معاملہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی تفریق روا نہیں رکھی جائے گی۔ ترکی حکومت کو ترکی علاقوں پر

www.rahimia.org

حکومت کی اجازت ہوگی۔ غیر ترکی علاقوں کو وہ اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکتا۔'' (16)

اس کے بعد وفدِ خلافت نے فرانس اور اٹلی کا دورہ بھی کیا۔ اخبارات و رسائل کے ذریعے زبردست پروپیگنڈا کیا، مگر سب بے نتیجہ رہا۔ اور آٹھ ماہ کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ آخر وفد اکتوبر میں ہندوستان واپس آ گیا۔ واپسی پر 16 اکتوبر 1920ء کو مولانا محمد علی نے بمبئی میں پہلی تقریر کی۔ اس میں وفد کی ناکامی کے اسباب بیان کیے۔ اور 20 اکتوبر کو لاہور کے عظیم الشان جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''جو وفدِ خلافت آپ نے امرتسر سے مرتب کر کے انگلستان بھیجا تھا، اس کے حالات مختصراً عرض کروں گا۔ جو پیغام آپ نے انگلستان کی قوم اور حکومت کو اور ان کی شریک حکومتوں کو بھیجا تھا، وہ ہم نے بلاکم و کاست پہنچا دیا۔ ہمارا فرض یہ تھا کہ ہم ان لوگوں کو بتا دیں کہ مسلمانوں کی مذہبی پابندیاں کیا ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات مسئلہ خلافت کے متعلق کیا ہیں۔ اور ہندوستان کا مطالبہ خلافت اور جزیرۃ العرب کی نسبت کیا ہے؟ میرا فرض یہ تھا کہ میں انگلستان والوں کو بتا دوں کہ اگر ہمارے مذہبی فرائض کا خیال نہ کیا گیا تو اس کے نتائج کتنے بُرے ہوں گے۔ ہم پہلے ہی جانتے تھے کہ اس میں کامیابی نہ ہوگی۔ مہاتما گاندھی جی ابھی آپ کو بتا دیں گے کہ یہ گورنمنٹ کس قدر دغا باز، مکار اور فریبی ہے۔ یہ ہمیں سب کچھ معلوم تھا، لیکن صرف اتمامِ حجت باقی تھا۔'' (17)

مولانا جوہر کو جیسا کہ انھوں نے تقریر میں کہا، وفد کی ناکامی کا یقین تھا، لیکن وہ اتمامِ حجت کے لیے وہاں گئے تھے۔ اربابِ بصیرت کو بھی وفد کی ناکامی کا احساس تھا۔ اور وہ مخالف تھے کہ اس طرح کاسہ گدائی کرنا مسلمان کی غیرت وحمیت کے خلاف ہے۔ اس کا واحد حل برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کرے بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلمانوں کو ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چناں عار باید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

تحریکِ ہجرت

یہ تحریک، خلافت تحریک سے الگ نہیں ہے۔ اس کے بھی محرک وہی بزرگ ہیں، جو تحریکِ خلافت کے تھے۔ اور انھوں نے ہی اپنی کاوشوں سے اسے پروان چڑھایا ہے۔ مگر علما کے نظریاتی اختلاف اور تحریکِ خلافت کے بعض دوسرے رہنماؤں کی مصلحتوں کے سبب یہ تحریک زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ اور بہت جلد ختم ہوگئی۔ تاہم اس سے خلافت تحریک کو بڑا فائدہ پہنچا۔ دراصل تحریکِ خلافت کے وفود کی ناکامی سے یہ احساس شدت اختیار کر گیا تھا کہ برطانیہ اسلام دشمن ہے۔ اور دنیا میں کہیں اسلام اور مسلمان اس کی دست برد سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس لیے جہاد یا ہجرت میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ جہاد کی طاقت وقوت تو تھی نہیں، اس لیے ہجرت اس کا متبادل راستہ تھا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے برطانیہ کے ماتحت ہندوستان کو ''دارالحرب'' قرار دیا تھا۔ اور ہندوستان سے ہجرت کر جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس کے بعد مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ اور ان کے ساتھیوں نے ہجرت کی۔ اب پھر یہ موقع ایسا آیا تھا کہ ہندوستان سے ہجرت کر جانے کی آواز اُٹھی۔ اور اس کے محرک علی برادران ہی تھے۔ (19) اور تحریک کے دوسرے رہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا ظفر علی خانؒ اور عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بھی اس سے متفق تھے۔ دراصل اس وقت افغانستان کے امیر امان اللہ خان نے اپنے سیاسی مقاصد کے پیش نظر ہندوستان کے مسلمانوں کو افغانستان آنے کی عام اجازت دے دی تھی۔ چناں چہ تحریکِ خلافت کے کارکنوں نے افغان حکومت کی پیش کش کو مدنظر رکھتے ہوئے اپریل 1920ء کی خلافت کانفرنس دہلی میں ہجرت کی ضرورت پر زور دیا۔ ایک موقع پر مولانا محمد علیؒ نے یہ تک کہہ دیا:

> ''ہم دونوں بھائیوں نے آپس میں اقرار کیا تھا کہ اگر وقت آجائے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر ہجرت ضروری ہوجائے تو چاہے میرا بڑا بھائی ہندوستان کے اندر رہ جائے، میں یہاں سے ہجرت کر جاؤں گا۔ اسی طرح بڑے بھائی نے عہد کیا تھا کہ چاہے چھوٹا بھائی ہندوستان کے اندر رہ جائے، مگر میں ہجرت سے باز نہ آؤں گا۔'' (20)

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ علما سے فتویٰ جاری کرایا جائے تاکہ لوگوں میں ہجرت کے لیے جوش وخروش پیدا ہو۔ چناں چہ تحریکِ خلافت کے سرکردہ رہنما اس وقت کے نامور عالم مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے استفسار کیا گیا تو انھوں نے من حیث المجموع ہجرت کے خلاف فتویٰ دیا۔ البتہ غلام احمد امرتسری کے استفسار کے جواب میں جو تار دیا تھا، اس میں بوجوہ ہجرت کر جانے کی تائید تھی۔ تار کے اس مضمون کی اخبارات نے بڑے پیمانے پر تشہیر کی۔ اور یہ تأثر عام ہوگیا۔ گویا مولانا نے ہجرت کرنے کے بارے میں فتویٰ جاری کر دیا۔ اگرچہ خود مولانا نے اس کی تردید بھی کر دی تھی، مگر بعض علما نے، جو ہجرت کے حامی تھے، اس کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اور ہجرت کو ضروری سمجھا۔

www.rahimia.org

البتہ انھوں نے یہ کہا کہ جو لوگ ہجرت نہ کریں، وہ ہندوستان میں رہ کر خلافت تحریک کے لیے کام کریں۔ اور حکومت سے عدمِ تعاون جاری رکھیں۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور ان کے معاونین مولانا داؤد غزنویؒ، مولانا محمد عبدالقادر قصوریؒ، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادیؒ اور مولانا محی الدین قصوریؒ وغیرہ نے اس تحریک کے لیے رائے ہموار کی، جس کے بہت مثبت نتائج نکلے۔ یہاں تک کہ عدمِ تعاون کی تحریک ماند پڑ گئی۔ علی برادران ان کے ساتھ نہ تھے۔ ساری تحریک مولانا ابوالکلامؒ کے ہاتھ میں تھی۔ چناں چہ 18 مئی 1920ء سے ہجرت کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں 133 افراد نے افغانستان ہجرت کی۔ اور چند مہینوں میں یہ تعداد چالیس ہزار ہوگئی، لیکن 13 اگست کو افغانستان نے مہاجرین کے لیے سرحد بندی کردی۔ اور یہ تحریک چند ہی ماہ میں اختتام کو پہنچ گئی۔

اس تحریک میں چند رہنماؤں کے علاوہ تحریکِ خلافت اور جمعیۃ العلما ہند نے گرم جوشی سے حصہ نہیں لیا، بلکہ اس مسئلے کو انفرادی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ اس کے علاوہ دوسرے زعما حکیم اجمل خاںؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، ڈاکٹر مختارالدین احمد انصاریؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، چودھری خلیق الزمان، محمد علی جناح، سر محمد شفیع، سر فضل حسین اور علامہ اقبال نے بھی اس کی مخالفت کی۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کا خیال تھا کہ ہجرت کے باب میں مسلمانوں نے بہت عجلت سے کام لیا۔ انھیں بھرپور انداز میں تحریکِ ترکِ موالات میں حصہ لینا چاہیے تھا۔ پہلے اس کے نتائج دیکھ لیتے، پھر یہ اقدام کرتے۔ (21)

بہر حال تحریکِ ہجرت نے جو جوش و خروش اور بیداری پیدا کردی تھی، اس سے تحریکِ خلافت کو بہت فائدہ پہنچا۔ اور اس کے خاتمے کے ساتھ ہی ترکِ موالات میں ایک دم شدت آ گئی۔

ترکِ موالات

شرعی احکام کے مطابق جس دشمن سے اسلامی شان و شوکت اور مذہبی ناموس و غیرت مجروح ہوتی ہو۔ اسلامی سلطنت تباہ و برباد ہوتی ہو۔ مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی ہوتی ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ہر ممکن جدوجہد سے اسے روکیں۔ اس ضمن میں مسلمانوں پر ''ترک و اختیار'' لازم آتا ہے۔ ''ترک'' سے مراد ان تمام تعلقات کا ترک کردینا ہے، جن سے دشمن کی اعانت و موالات ہوتی ہو۔ اور ''اختیار'' سے مقصود یہ ہے کہ وہ تمام وسائل اختیار کیے جائیں، جن کے ذریعے دفاع کا فریضہ انجام پا سکے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی کتاب ''مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب'' میں جو تصریح کی ہے، اس کا ماحصل یہ ہے:

> ''ترکِ موالات یہ ہے کہ جو غیر مسلم، مسلمانوں کے حریف، دشمن اور حملہ آور فریق کا حکم رکھتے ہوں، ان سے تمام ایسے تعلقات منقطع کرلینا، جو محبت، خدمت اور اعانت پر مبنی ہوں۔ اگر کوئی مسلمان ان سے ایسا تعلق رکھے گا تو اس کا شمار بھی شریعت کے نزدیک انھیں غیر مسلموں میں ہوگا۔''

www.rahnuma.org

19 جنوری 1920ء کو وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ کو اکابرین نے جو یادداشت پیش کی تھی، اس کا جواب موصول ہونے پر غور و فکر کے لیے دہلی میں ایک اجتماع ہوا اور گاندھی جی نے اس میں عدمِ تعاون کا پروگرام پیش کیا، جس کی تفصیل ہم دوسری خلافت کانفرنس کی ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔ اس پر ردوقدح کے بعد میرٹھ کے اجلاس میں ''ترکِ موالات'' کی تجویز منظور ہوگئی۔ اور علمائے کرام سے فتوے حاصل کیے گئے۔ چناں چہ مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، علمائے بدایوں، علمائے سہارن پور، علمائے کان پور اور علمائے دہلی وغیرہ سب ہی نے متفقہ طور پر ''ترکِ موالات'' کو جائز ہی نہیں، بلکہ واجب قرار دیا۔ اور اس سلسلے میں ہنود کی مددواستعانت کو جائز ٹھہرایا۔ چناں چہ ''ترکِ موالات'' کی تحریک شروع ہوگئی، لیکن درمیان میں ہجرت تحریک نے زور پکڑا، جس کے محرک بھی اگرچہ تحریکِ خلافت کے قائدین ہی تھے، مگر وہ اسے ابتدا میں نہیں، بلکہ ترکِ موالات کے نتائج دیکھ کر شروع کرنے کے حامی تھے۔ اس لیے وہ شریک نہیں ہوئے۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ تحریک چند ہی ماہ میں دم توڑ گئی۔

''ترکِ موالات'' کی تحریک یکم اگست کو شروع کی گئی۔ اس نے اس وقت زور پکڑا، جب محمد علی جوہرؒ انگلستان سے واپس آئے۔ اور انھوں نے ملک کے طول و عرض میں دورے کر کے وفد کی ناکامی کے اسباب بیان کیے۔ اور تحریک کے پروگراموں پر لوگوں کو آمادہ کیا۔ اور ہنود کے تعاون و اشتراک کو مدِنظر رکھتے ہوئے ''سوراج'' کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔ مولانا محمد علی جوہرؒ نے اودھ خلافت کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے اس طرح اس کی وضاحت کی:

''ہمیں سوراج کیوں ضروری ہے؟ اور اس کا خلافت سے کیا تعلق ہے؟ برادرانِ من! آئندہ ایسی مشکلات پیش نہ آنے کی ضمانت کے لیے سوراج ضروری ہے۔ اگر ہم کو اپنی فوج پر اختیار نہ ہوگا تو کیا ضمانت ہے کہ وہی بدعتیں جو آج ہماری فوج کی وجہ سے کی گئیں، پھر نہ دہرائی جائیں گی۔''

ایک موقع پر فرمایا:

''موجودہ حالت پر ایک نظرِ غائر ڈال کر میں اس صریح نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلام کی آزادی کے لیے ہندوستان کی آزادی قطعی ضروری ہے۔ ہندوستان کے غلام، دوسری قوموں کی آزادی سلب کرنے یا انھیں حلقہ بگوش بنانے میں استعمال کیے جاتے ہیں۔

اس لیے میں مسلمانانِ ہند کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اسلام کو آزادی دلانا چاہتے ہیں تو انھیں اپنے برادران ''ہنود'' کے ساتھ مل جانا چاہیے۔ میں ہندوؤں سے بھی یہ کہتا ہوں کہ اگر آپ خودمختاری اور آزادی کے خواہاں ہیں تو اپنے مسلم ہمسایوں کے ساتھ عدمِ تعاون میں شریک ہوں۔''(23)

مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے ''ترکِ موالات'' کے سلسلے میں مولانا شوکت علیؒ کے خط کے جواب میں تحریر کیا:

''اب یہ قوم کے عام افراد کے ہاتھ میں ہے کہ وہ زندہ رہنے کے خواہش مند ہیں تو

www.rahimia.org

''ترکِ موالات'' کریں۔ دنیا بھی پاویں اور دین بھی حاصل کریں۔ ورنہ ہندوستان کی موت ہے۔ قیامت ہے۔ سوچنے کا وقت گزر گیا۔ میں نے اور پنڈت مدن موہن مالوی نے اوّل مجلس مشاورت میں ''ترکِ موالات'' حصولِ مقصد ہونے کی مخالفت کی تھی۔ مگر جلد ہی متنبہ ہوگیا۔ اور شریعت کی ہدایت کے باعث گاندھی صاحب کے اتباع میں اس کا خاص مؤید بن گیا۔ اور مالوی نے رفتہ رفتہ مدارج ''ترکِ موالات'' کا مؤقف سمجھا۔ اس سے ظاہر ہوگیا کہ عقل دین و دنیا دونوں آخر میں ایک جگہ مجتمع ہوگئیں۔ مسلمانوں کا تأمل خطرناک ہے۔'' (24)

لیکن اس سلسلے میں اکابرین تحریک خلافت تشدد کے قائل نہ تھے، بلکہ وہ عدمِ تشدد کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ گجرات کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں مولانا محمد علیؒ نے فرمایا:

''میں پُرامن تارکِ موالات ہوں، لیکن اگر ترکِ موالات کی تحریک ناکام رہی تو میں جیسا کہ پہلے کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں، اب پھر کہتا ہوں کہ ہم جنگ سے کام لیں گے، کیوں کہ ہم بھی خدا کی طرف سے اپنے مذہب کے حکم بردار ہیں۔ یہ حکم برداری ہمیں خدائے کریم نے سونپی ہے۔ ہم میں سے کوئی اگر حکم برداری کے ساتھ جنگ نہ کرے تو وہ مسلمان نہیں رہتا۔'' (25)

انگریز بڑا شاطرانہ ذہن رکھتا ہے۔ اس نے ہندوستان میں بظاہر مطلق العنان حکومت قائم نہیں کی، بلکہ قانون ساز ادارے، کونسلیں اور عدلیہ کا نظام قائم کیا، جس میں ملکی نمائندے بھی لیے گئے، تاکہ دنیا کو بتا سکے کہ ملک کے اپنے نمائندے ہی ملک کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس کی آڑ میں وہ سب کچھ کر گزرتے تھے۔ تعلیمی نظام ان کا مرتب کردہ تھا، جس کے فیض یافتگان میں جرأت و ہمت کا فقدان تھا۔ مصلحت اندیشی اور حالات سے سمجھوتا کی ان میں فطرت پیدا ہوگئی تھی۔ اس لیے اس محاذ سے انھیں چنداں خوف نہ تھا۔ ڈر تھا تو قدیم طرزِ تعلیم کے علم برداروں اور فیض یافتگان سے۔ اور زیادہ تر وہی اس تحریک کو اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ بہرحال ترکِ موالات میں جو پروگرام ترتیب دیا گیا، اس میں عدالتوں، فوجی ملازمتوں، اعزازات، حکومت کے تحت چلنے والے تعلیمی اداروں اور غیر ملکی مصنوعات کا بائیکاٹ شامل تھا۔ اور یہ پروگرام یکم اگست سے بڑے زور و شوق کے ساتھ شروع ہوا۔

1۔ عدالتوں کا بائیکاٹ

ترکِ موالات میں عدالتوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا۔ اس میں ایک نکتہ تو یہ تھا کہ عوام الناس میں سے کوئی اپنا مقدمہ حکومت کی عدالتوں میں نہ لے کر جائے۔ اس لیے کہ ان سے کسی بھی طرح سے انصاف کی قطعاً کوئی اُمید نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انگریز حکومت کی عدالتوں سے کسی کو انصاف نہیں ملا۔ جنگِ آزادی سے لے کر آج تک کے مقدمات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ بے گناہوں کو سزائیں ملی ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ اس سلسلے میں کہتے ہیں:

''گورنمنٹ ایک طرف تو یہ چاہتی ہے کہ شخصی حکمرانوں کی طرح بے دریغ جبر و تشدد کرے۔ دوسری

طرف یہ چاہتی ہے کہ نمائشی قانون و عدالت کی آڑ بھی قائم رہے۔ یہ دونوں متضاد باتیں جمع نہیں ہوسکتیں.......فی الحقیقت ''لا'' اور ''آرڈر'' (Law & Order) کا ایک ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے، جسے ہم کامیڈی اور ٹریجڈی دونوں کہہ سکتے ہیں۔ وہ تماشے کی طرح مضحک (مضحکہ خیز) بھی ہے۔ اور مقتل کی طرح دردانگیز بھی، لیکن میں ٹریجڈی کہنا زیادہ پسند کروں گا۔ حسن اتفاق سے اس کا چیف ایکٹر انگلستان کا سابق چیف جسٹس ہے۔'' (26)

عدالتوں کے بائیکاٹ کے فیصلے پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور جمعیۃ العلما ہند بھی خلافت کمیٹی کے فیصلے سے متفق تھی۔ اس لیے اس میں اور زیادہ شدت آگئی۔ اس کا دوسرا نکتہ یہ تھا کہ عدالتوں کے بائیکاٹ کے ساتھ اس کے لیے متبادل نظام بھی قائم کیا جائے، تاکہ وہ اپنے فیصلے وہاں کرسکیں۔ مولانا محمد علی جوہرؒ نے دہلی و اَجمیر کانفرنس میں کہا:

''اگر آپ سوراج حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے مقدمات خود ہی فیصل کیا کریں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آئرلینڈ کی خبریں جو آپ پڑھا کرتے ہیں کہ آج فلاں چوکی پر حملہ کیا۔ اتنے سپاہی مار ڈالے۔ اتنے افسروں کو قتل کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں نے ہرگز گورنمنٹ کو خوف زدہ نہیں کیا ہے، بلکہ جس بات نے برٹش حکومت کو مرعوب کر دیا ہے۔ اور اس کو بے کار بنا دیا ہے۔ وہ ان کی قومی عدالتیں ہیں۔ تین چوتھائی (3/4) لوگ انگلستان کی عدالتوں میں اپنا کوئی مقدمہ نہیں لے جاتے۔ چور کو وہاں کی قومی عدالت انگلستان کا دیس نکالا دیتی ہے۔ گورنمنٹ اس کو ورغلاتی ہے، مگر وہ چور اس کو جواب میں کہتا ہے کہ میں اپنی قوم کے فیصلے کی پابندی کروں گا۔ اور ہرگز تمہاری حفاظت نہیں چاہوں گا...... مجھے معلوم ہوا ہے کہ دہلی کی ثالثی قومی عدالت میں اس وقت تک چار فیصلے ہوچکے ہیں، جن میں سب سے زیادہ مالیت کے جو مقدمے کا فیصلہ ہوا، اس کی مالیت سترہ ہزار تھی۔ اور اب پچاس کے قریب مقدمات زیرِ تجویز ہیں...... مجھے اُمید ہے کہ اَجمیر شریف میں بھی اس کا التزام رکھا جائے گا۔ اور وہاں آپس کے مقدمات کا فیصلہ بھی کیا جائے گا۔ اگر وہ آپس میں فیصلہ نہ کرسکیں تو سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی درگاہ میں چلے جایا کریں۔ اور وہاں فیصلے کرلیں۔'' (27)

عدالتوں کے بائیکاٹ کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وکلا اور جج صاحبان بھی عدالتوں کا بائیکاٹ کریں۔ ملازمتوں سے دست بردار ہوجائیں۔ اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے دہلی کے آصف علی بیرسٹر، سیالکوٹ کے آغا محمد صفدر، دھام پور کے مرزا عبداللطیف، حیدرآباد، سندھ کے میاں امین الدین اور دوسرے بہت سے لوگوں نے وکالت ترک کردی۔ اور مجسٹریٹ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

2۔ اعزازات و خطابات کی واپسی

ترکِ موالات کے ذیل میں اعزازات اور خطابات کی واپسی بھی تھی۔ تحریک کے قائدین نے جگہ جگہ جلسوں

میں اس کا مطالبہ کیا کہ وہ حکومتِ ہند کے دیے ہوئے اعزازات اور خطابات واپس کردیں۔ علمائے کرام نے متفقہ فتویٰ دیا کہ بوجوہِ ذیل خطابات یا اعزازت رکھنا مسلمان کے لیے حرام ہے:

☆ اعزازی عہدوں پر فائز حضرات کو حکومتِ ہند کے قوانین کے مطابق چلنا اور فیصلہ کرنا ہوتا ہے، جو حرام ہے۔

☆ ان کی وجہ سے مداھنت فی الدین کرنی پڑتی ہے۔

☆ خطاب یافتہ اعدائے دین سے عزت و جاہ کے طالب ہوتے ہیں۔ حال آں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

چناں چہ ہند میں اشتراک و تعاون کی فضا قائم کرنے کے لیے یکم اگست کو سب سے پہلے گاندھی جی نے تمغۂ قیصر و تمغۂ جنگِ بوئر واپس کردیا۔ اور بہت سے لوگوں نے، جن میں حکیم اجمل خاں، دہلی نے (حاذق الملک)، سید آلِ نبی، آگرہ نے (خان بہادر)، مولانا شاہ بدرالدین، پھلواری شریف نے (شمس العلماء اور تمغۂ قیصر)، حافظ محمد ابراہیم، دیوبند نے (شمس العلماء) سیٹھ جان محمد چھوٹانی، بمبئی نے (جسٹس آف پیس)، نواب اسماعیل خان، جہاں گیر آباد نے (آنریری مجسٹریٹ)، سید حاجی محمد شاہ،، آخوند نور محمد، میاں غلام محمد، سندھ نے (آنریری مجسٹریٹ)، مسز مری لال دیوی، لاہور نے بھرتی کے صلہ کا خطاب اور رابندر ناتھ ٹیگور، بنگال نے (سر) وغیرہ اور دوسرے بہت سوں نے اپنے اعزازات و خطابات واپس کردیے، لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جیسی توقع تھی، ویسی لوگوں نے اس طرف توجہ نہ دی۔

3۔ کونسل کی ممبری کا مقاطعہ

ملک کے قانون ساز اداروں میں عوام کے نمائندے اور غیر سرکاری ممبران بھی شامل ہوتے تھے، مگر ان کی حیثیت کچھ بھی نہیں تھی۔ جو کچھ بھی اختیار ہوتا، وہ سرکاری ممبران کو ہی ہوتا۔ جب رولٹ ایکٹ کی تمام غیر سرکاری ممبروں نے مخالفت کی تو ان کی مخالفت نظر انداز کر کے ایکٹ منظور کرلیا۔ یہ ان کی وقعت و حیثیت تھی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر تحریک موالات میں کونسل کی ممبری سے علاحدگی کا مطالبہ بھی تھا۔ چناں چہ مولوی فضل حق، کلکتہ نے (ممبر لیجسلیٹیو کونسل بنگال)، مسٹر شریف دیوجی کانجی، بمبئی نے (ممبر مجلس قانون ساز)، سیٹھ یعقوب حسن، مدراس نے (ممبر کونسل مدراس)، میاں محمد ہاشم، سید اسحٰق شاہ، سید جان محمد رئیس، سندھ (ممبر) وغیرہ نے کونسل سے علاحدگی اختیار کرلی۔ لیکن اس ضمن میں بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک موقع پر خطاب کرتے ہوئے حکیم اجمل خاں صاحبؒ نے فرمایا:

> ''خطاب یافتہ اور ممبران کونسل، یہ وہ طبقہ ہے جو قدرتی طور پر اس قابل نہیں کہ فوراً ہماری آواز کو سن سکے۔ لیکن یہ تو بتاؤ، ان لوگوں کی قوم کے اندر کیا وقعت ہے؟ آج ان اصحاب کی قیمت، مجھے وہ حضرات

معاف فرمائیں جو اس وقت کونسل کے ممبر ہوں اور یہاں تشریف رکھتے ہوں، کیوں کہ میرا ذاتی روئے سخن کسی شخص کی طرف نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آج ان لوگوں کی، جو اَب بھی گورنمنٹ کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ خواہ کونسل کے ممبر ہوں یا خطاب یافتہ ہوں، وقعت دوسرے درجے کے شہری کی وقعت سے زیادہ گری ہوئی ہے۔'' (28)

4۔ تعلیم

ترکِ موالات کے پروگرام میں ایسے تعلیمی اداروں سے مقاطعہ بھی شامل تھا، جو حکومت کی طرف سے قائم کیے گئے تھے۔ یا ان کی امداد سے چل رہے تھے۔ اس سلسلے میں 20 ستمبر 1920ء کو خلافت کانفرنس اور جمعیۃ العلما ہند نے کلکتے کے اجلاس میں متفقہ فتویٰ جاری کیا۔ تعلیم کا مقاطعہ بڑا حساس اور نازک معاملہ تھا۔ جنگِ آزادی کے بعد رہنمایانِ ملت نے بڑے غور وخوض کے بعد جدید تعلیم کو ہتھیار کے طور پر تسلیم کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اب وقت بدل چکا ہے۔ ہندوستان میں ہندو قوم انگریزوں کے مقابلے میں صف آرا ہونے کی بجائے جدید تعلیم حاصل کر کے اپنے لیے ترقی کی راہیں ہموار کر رہی ہے۔ اور مسلمان انگریز کی مخالفت کر کے زندگی کے ہر شعبے میں پیچھے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے اب جنگ و جدال سے کام نہیں چلے گا، بلکہ مفاہمت کا رویہ اختیار کر کے جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ چناں چہ ملک میں تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ ان میں ایم۔ اے۔ او کالج، علی گڑھ اور اسلامیہ کالج لاہور بہت اہم تھے، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے جدید تعلیم کو اختیار کر کے بھی کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ یہاں ہمیں یہ بحث نہیں اُٹھانی۔ البتہ اس دور میں بھی اس کی بڑی مخالفت ہوئی۔ اور اکبر الہ آبادی نے تو یہاں تک کہہ دیا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

پھر جب ترکِ موالات کی تحریک کے تحت تعلیم کے مقاطعے کا سوال اُٹھا تو خلافت تحریک کے رہنماؤں نے جو خود بھی جدید تعلیم سے بہرہ مند ہوئے تھے، اس طرح اس تعلیم کے ثمرات کو بیان کیا۔ مولانا محمد علی جوہرؒ نے اپنی تقریروں میں کہا:

> ''موجودہ حکومت ہمارے طلبا کو سوائے غلامی کی تعلیم کے اور کوئی تعلیم نہیں دیتی .... سب سے بڑا اَثر موجودہ تعلیم کا یہ ہے کہ ایک پیشہ نوکری یا وکالت کو ہم چھوڑ دیں تو دوسرا پیشہ اختیار کر کے پیٹ بھرنے سے معذور ہیں۔'' (29)

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بڑے واشگاف انداز میں جدید تعلیم کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی اس طرح وضاحت کی:

www.rahimia.org

''ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائل و اعمال کو پہنچائے ہیں، ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیل علم کا مقصدِ اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہو گیا ہے۔ علم خدا کی ایک پاک امانت ہے۔ اور اس کو صرف اس لیے ڈھونڈنا چاہیے کہ وہ علم ہے، لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک دوسری راہ بتلائی ہے۔ وہ علم کا اس لیے شوق دلاتی ہے کہ بلا اس کے، سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ پس اب ہندوستان میں علم کو علم کے لیے نہیں، بلکہ معیشت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی بڑی تعلیمی عمارتیں، جو انگریزی تعلیم کی نوآبادیاں ہیں، کس مخلوق سے بھری ہوئی ہیں؟ مشتاقِ علم اور شیفتگانِ حقیقت سے؟ نہیں! ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالہ چانولوں کے پرستاروں سے۔ جن کو یقین دلایا گیا ہے کہ بلاحصولِ تعلیم کے وہ اپنی غذا حاصل نہیں کر سکتے۔'' (30)

بہرحال جب تحریک کی طرف سے تعلیمی اداروں سے مقاطعے کا اعلان ہوا تو بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں بھی یہی سوال پیدا ہوا کہ اگر تعلیم کا بائیکاٹ کیا گیا تو قوم بہت ہی پیچھے چلی جائے گی۔ اور یہ ایسا نقصان ہوگا کہ اس کی تلافی ناممکن ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ایک سوال یہ بھی تھا کہ تحریک کے قائدین نے اس کا متبادل انتظام نہیں کیا۔ چناں چہ سنجیدہ لوگ بھی مخالف ہو گئے۔ اور مخالفت میں مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کا مشہور فتویٰ ''المحجة الموتمنة فی آیات الممتحنة'' جاری ہوا، جس میں ہنود سے تعاون اور ترکِ موالات کا رد کیا گیا۔

ادھر تحریک کے حامیوں کا یہ خیال تھا کہ تھوڑے عرصے کے لیے تعلیمی اداروں کو بند کر دینے سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ مولانا جوہرؒ نے لاہور کے جلسے میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

''جرمنی میں پانچ برس یونیورسٹیاں بند رہیں۔ وہاں کیا قیامت آ گئی؟ تم کہاں کے اتنے بڑے تعلیم کے حامی آ گئے؟ کبھی وقت تھا کہ تم تعلیم کی طرف آتے بھی نہ تھے۔ ایسے محبِّ تعلیم بن رہے ہو کہ خدا اور رسول ﷺ کو بھی اس کی خاطر قربان کرنے کو تیار ہو۔ یہ وہ شرک ہے، جس کے بدلے میں تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔'' (31)

انھوں نے اس ضمن میں کہ سرکاری اداروں میں تعلیم حاصل نہیں کریں تو کیا کریں؟ ڈی۔ اے۔ وی کالج یعنی دیا نند اینگلو ویدک کالج لاہور کی مثال دی، جو 1886ء میں قائم ہوا تھا۔ اور راجہ مہاراجوں اور سرکاری امداد کے بغیر چل رہا تھا۔

غرض تحریک شروع ہوئی۔ قائدین کا خیال تھا کہ ہم نے اگر علی گڑھ کالج اور اسلامیہ کالج لاہور میں اپنی تحریک کو کامیاب بنا لیا تو یہ تحریک پورے ملک میں کامیاب ہو جائے گی۔ مولانا شوکت علیؒ اور مولانا محمد علیؒ خود علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہاں ان کا اثر و رسوخ بھی زیادہ تھا۔ اس لیے کامیابی کی بہت زیادہ توقع تھی، لیکن خلافِ توقع ناکامی ہوئی۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور ٹرسٹیوں نے بڑی شدید مخالفت کی۔ اور پولیس کی مدد سے جبریہ کالج کی حدود

سے بے دخل کر دیے گئے۔ بعد میں خود طلبا نے تحریک کی حمایت میں جلسہ کیا۔ اور عدمِ تعاون کے لیے تیار ہو گئے۔ سینکڑوں نے کالج چھوڑ دیا۔ ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی تھے، جو اس وقت کالج میں اسسٹنٹ لیکچرار تھے۔ پھر متبادل انتظام کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ ہی میں قائم کیا۔ 29 اکتوبر 1920ء کو اس کا افتتاح ہوا۔ صدارت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے کی۔

آپ سخت بیمار تھے۔ بیٹھنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ چناں چہ خطبۂ صدارت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھ کر سنایا۔ آپؒ نے ارشاد فرمایا:

''میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر لبیک کہا کہ میں اپنی گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا اُمیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں، جن کے چہروں پر نور اور ذکراللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا اُٹھو اور اس اُمتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں، بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب و ضرب کا۔ ....اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار، جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم ''علی گڑھ'' کی طرف بڑھایا۔ اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں ''دیوبند اور علی گڑھ'' کا رشتہ جوڑا۔ ....آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں، وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔ ہاں! یہ بے شک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخر اثر یہی ہے، جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور اپنے مذہب والوں کا مذاق اُڑائیں یا حکومتِ وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا اچھا ہے۔ ....ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونا چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونی ورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے، جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا تھا۔ ضرورت ہے کہ ہماری تعلیم اغیار کے اثر سے کلیتاً آزاد ہو۔ کیا باعتبارِ عقائد و خیالات کے، کیا باعتبارِ اَخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبارِ اوضاع و اطوار کے ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔''

آخر میں آپؒ نے فرمایا:

''ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ اُمتِ اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا

www.rahimia.org

احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درس گاہوں میں جہاں علومِ عصریہ کی تعلیم دی جاتی ہو، اگر طلبا اپنے مذہب کے اصول و فروع سے بے خبر ہوں۔ اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں۔ اور ان میں اپنی ملت اور اپنی قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجے پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔

اس لیے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونی ورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا، جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر سے بالکل علاحدہ ہو۔ اور جس کا تمام تر عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔''(32)

اسی طرح علی برادران، مولانا ابوالکلام آزادؒ کو لے کر اکتوبر کے آخر میں لاہور پہنچے۔ 20 اکتوبر کو ایک عظیم الشان جلسے سے خطاب کیا۔ اور انھیں تعلیمی مقاطعے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اہل پنجاب آمادہ ہو جائیں تو تحریک کو نئی زندگی مل جائے گی۔ اس وقت اسلامیہ کالج لاہور، انجمن حمایتِ اسلام کی نگرانی میں چلتا تھا، جس کے سربراہ سر محمد شفیع اور سیکرٹری علامہ اقبال تھے۔ علامہ تعلیمی مقاطعے کے مخالف تھے، لیکن جب انجمن کی میٹنگ میں مولانا آزادؒ نے فتویٰ دیا تو تحریک منظور ہوگئی۔ اور مخالفین نے خاموشی اختیار کر لی۔

کلکتے میں مدرسہ عالیہ سرکاری امداد سے چلتا تھا۔ اس ادارے کی پورے ملک میں شہرت تھی۔ جب تعلیمی بائیکاٹ نے زور پکڑا تو مدرسہ عالیہ کے ڈیڑھ سو طلبا نے مدرسہ چھوڑ دیا۔ ان کی تعلیم کے لیے مولانا آزادؒ نے کلکتے کی جامع مسجد (مسجد ناخدا) میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس کے مہتمم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادیؒ ہوئے۔ اور مدرسین میں مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی شامل تھے۔

اکابرین کی ان کوششوں سے ملک میں ہر طرف سرکاری و نیم سرکاری اداروں کا بائیکاٹ ہوا۔ سینکڑوں ہزاروں طلبا نے تعلیمی ادارے چھوڑ دیے۔ انجینئرنگ کالج، میڈیکل کالج اور لا کالج تک بند ہو گئے۔ ڈیڑھ ہزار کے قریب قومی تعلیمی ادارے قائم ہوئے، جن میں سرکاری سکول و کالج سے زیادہ طلبا کی تعداد تھی۔ غرض یہ تحریک بڑے جوش و جذبے سے چلی۔

5۔ فوج، پولیس اور دوسرے محکموں سے ترکِ ملازمت

عدمِ تعاون کے ذیل میں فوج، پولیس اور دوسرے سرکاری محکموں سے استعفیٰ دینا بھی شامل تھا۔ علما نے حکومت کی ملازمت کو حرام قرار دیا تھا۔ خاص طور پر فوج اور پولیس کے محکموں میں ہندوستانیوں کی معاونت و ملازمت نہایت خطرناک ثابت ہوئی۔ جنگِ عظیم میں برطانیہ نے ہندوستان کی فوج کے بل بوتے پر ہی مسلمانوں کی عظیم سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ اور خلافت کو عملی طور پر ختم کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہرؒ کہتے ہیں:

''شام و فلسطین و عراق و عرب کو اور بیت المقدس کو سوائے تمہارے کس نے فتح کیا۔ ترکی افسر کو جو

موقعے پر خود موجود تھا، بیان ہے کہ انگریزوں کی تیس ہزار فوج، جس میں ہندوستانی تھے، ہمارے پانچ ہزار کے مقابلے میں آئے۔ وہ ڈھائی ہزار مقتولین چھوڑ کر بھاگ گئے۔ مگر افسر مذکور نے آپ کی ہندوستانی افواج کی بہادری تسلیم کی۔ اور وہ کہتا تھا کہ اگر ہندوستانی مقابلے میں نہ ہوتے تو ہرگز انگریزوں کی فتح نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ خود بہادر ہیں۔ اور اس لیے بہادروں کے اعتراف میں وہ کوئی کسرِشان نہیں سمجھتے تھے۔ حضرات! آپ میں اَخلاقی ہمت و جرأت ہے۔ آپ بہادر ہیں۔ جان دینے سے نہیں ڈرتے، مگر جیل میں جانے سے آپ ڈرتے ہیں۔ آپ اس وقت تک، جب تک کہ آپ ہتھکڑیوں کو مردوں کا زیور نہ سمجھیں، بہادر کہلانے کے مستحق نہیں ہوسکتے۔''

سلسلۂ زنجیر شیراں را بگردن زیور است

مگر افسوس کہ آپ کی شان ''کھیدے کے ہاتھی کی سی'' ہے، جو مہاوت کے آنکس (لوہے کا کڑا) سے ہر وقت ہراساں رہتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ میسور میں کھیدے کا ایک ہاتھی چھوٹ کے بھاگ گیا ہے۔ حضرات! یہ آپ کے لیے ایک نیا فال ہے، جو مہاوت ہمارے سر پر ہے، اس کی کوئی وقعت نہیں .... میں ہندوستانیوں سے کہتا ہوں کہ اگر اس وقت آپ کی فوج ہندوستان سے باہر گئی تو ہرگز ہندوستانیوں کو سوراج حاصل نہیں ہوسکتا۔'' (33)

چناں چہ بہت لوگ فوج کی ملازمت سے دست بردار ہوگئے۔ پولیس کے محکمے سے بھی بہت سے لوگوں نے علاحدگی اختیار کرلی۔ ان میں عہدے دار بھی شامل تھے۔

6۔ سودیشی اشیا کا استعمال

تحریکِ ترکِ موالات میں غیر ملکی اشیا کے استعمال سے اجتناب بھی شامل تھا۔ قائدین نے سودیشی اشیا کے استعمال پر زور دیا تا کہ غلامانہ ذہنیت کا خاتمہ ہو۔ قومی عزت و وقار کا احساس پیدا ہوا۔ ملکی معیشت کو ترقی ہو۔ خام مال کے ملک کے اندر استعمال ہونے سے صنعتوں کو ترقی اور بے روزگاری کا مسئلہ حل ہو۔ تحریک کے قائدین نے خود بھی اس پر عمل کیا۔ انھوں نے باوجود اس کے کہ لندن وغیرہ میں تعلیم حاصل کی تھی، کھدر پہنا۔ گاندھی جی نے 18 جولائی 1921ء کے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں کھدر کی اسکیم پیش کرکے اتفاقِ رائے سے منظور کرالی۔ اس کی صرف مولانا حسرت موہانی نے مخالفت کی۔ وہ صرف کھدر کے ہی پابند نہیں ہونا چاہتے تھے۔ انھوں نے سودیشی تحریک شروع کی۔ کان پور میں ایک سودیشی اسٹور قائم کیا، جس میں ملک کا بنا ہوا ہر قسم کا کپڑا فروخت ہوتا تھا۔

غرض تحریکِ موالات بڑے زور و شور سے پورے ملک میں شروع ہوئی۔ اور مخالفت کے شدید طوفان کے باوجود اس کی پذیرائی ہوئی۔ لوگوں نے ملازمتوں سے استعفے دے دیے۔ فوج اور پولیس کو چھوڑ دیا۔ خطابات واپس کردیے۔ اعزازات کو لات ماردی۔ تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا۔ غیر ملکی اشیا کے استعمال کو ترک کیا۔ اور نہایت

جوش وخروش سے اپنے دینی اور ملی فریضے کو انجام دیا۔

اگر ہندوستان کے کل مسلمان تمام اختلافات اور مصلحتوں کو بھلا کر اس تحریک میں شریک ہوتے تو آج کچھ اور ہی نقشہ ہوتا۔ مولانا محمد علی جوہرؒ نے ایک موقع پر کہا تھا:

''ہم گورنمنٹ سے ترکِ موالات، اس کو مفلوج کرنے کے لیے نہیں کر رہے، بلکہ ہم تو اپنے فالج کو، جو ہمارے دل و دماغ پر ہے، دور کرنے کے لیے عدمِ موالات کر رہے ہیں۔ اور اس کے بعد جو گورنمنٹ ہوگی، وہ وہی ہوگی، جس کو اللہ چاہے گا۔ اور ہم چاہیں گے۔''(34)

تحریکِ خلافت کا خاتمہ

تحریکِ خلافت کی ابتدا 1919ء میں ہوئی۔ اس کے تحت وائس رائے ہند اور وزیر اعظم برطانیہ سے ملاقات کرنے کے لیے وفود بھیجے گئے، مگر سب لا حاصل۔ پھر یکم اگست 1920ء سے ترکِ موالات کی تحریک چلی۔ اکتوبر میں محمد علی جوہرؒ بھی وطن واپس آ گئے۔ اور بڑے جوش وخروش سے تحریک چلی۔ علی برادران اس تحریک کے روح رواں تھے۔ ان کی والدہ محترمہ اماں بی نے بھی ضعف و ناتوانی کے باوجود اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور قوم کے بچے بچے کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا! خلافت پہ دے دو

حکومت نے ابتدا میں تو درگزر کی پالیسی اختیار کی۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی بھی تحریک زیادہ عرصہ نہیں چل سکتی۔ عوام کب تک ساتھ دیں گے۔ اس لیے تحریک کو طول کھینچنے دو۔ اس کے مقابلے میں تحریک کے رہنماؤں کی مصلحت یہ تھی کہ جلد از جلد کوئی نتیجہ برآمد ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ تحریک کے رہنما، ملک کے طول وعرض میں عوام کے جذبات کو بھڑکانے میں کام یاب ہو گئے۔ بنگال اور یوپی میں بڑی تعداد میں لوگوں نے سرکاری ملازمتیں چھوڑ دیں۔ آندھرا ضلع میں کسانوں اور کاشت کاروں نے سرکاری واجبات دینے سے انکار کر دیا۔ آسام میں چائے کے باغات میں کام کرنے والے مزدوروں نے اُجرت بڑھانے کا مطالبہ کیا۔ اور زبردست ہڑتال کر دی۔ بنگال میں ریلوے اور اسٹیمروں کے ملازموں نے ہڑتال کی۔ (35) یہ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ ان کو روکنا ضروری تھا۔ چناں چہ حکومت نے ہر طرح پر اسے روکنے کی کوشش کی۔

9 جولائی 1921ء کو کراچی میں خلافت کانفرنس ہوئی۔ اس میں ایک قرارداد پاس ہوئی، جس میں کہا گیا تھا کہ ''مسلمان پر فوج کی ملازمت حرام ہے'' اسی کو بنیاد بنا کر تحریک کے سرکردہ رہنماؤں میں علی برادران، مولانا حسین احمد مدنی، پیر غلام مجدد سرہندی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا نثار احمد اور شنکر اچاریہ وغیرہ کو ملک معظم کے افواج کو

بغاوت پر اُکسانے کے جرم میں مختلف مقامات پر گرفتار کیا۔ دفعہ 144 نافذ کردی گئی۔ والنٹیر کور توڑ دی۔ اور سول گارڈ کے نام سے ایک سرکاری تنظیم قائم کردی۔ صرف حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور گاندھی جی باقی رہ گئے۔ 22 دسمبر کو خالق دینا ہال کراچی میں مقدمہ چلا۔ اس میں مولانا جوہرؒ نے ایمانی جوش سے اپنے دلائل پیش کیے۔ اور **کلمة الحق عند سلطان جائر** (ظالم حکمران کے سامنے سچا کلمہ بیان کرنا) کی بہترین مثال قائم کی۔

مقدمہ کراچی کے بعد حکومت غیظ و غضب میں پھر تشدد پر آمادہ ہوگئی۔ خلافت اور کانگریس کے دفتروں پر چھاپے مارے گئے۔ اور جو تحریک کا حامی نظر آیا، اسے گرفتار کرلیا۔

اسی اثنا میں 5 فروری 1922ء کو چورا چوری (ضلع گورکھ پور) میں دو ہزار دیہاتیوں نے رضا کاروں کی سرکردگی میں تھانے پر حملہ کرکے اس کو آگ لگا دی۔ اس میں 2 انسپکٹر، 18 کانسٹیبل اور 2 چوکیدار مارے گئے۔ اس سے متاثر ہوکر گاندھی جی نے باردولی میں کانگریس کا اجلاس بلایا۔ اور عدمِ تعاون کو ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا۔ بعد میں تحریک میں شامل تینوں جماعتوں، یعنی کانگریس، جمعیۃ علما اور خلافت کانفرنس نے اس کی توثیق کردی۔ اس سے عوام میں بد دلی پیدا ہوگئی۔ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خان نے سہارا دینے کی کوشش کی، مگر بے سود رہا۔ اس وقت خلافت تحریک کے تمام مرکزی رہنما جیل میں تھے۔ اس لیے حالات قابو سے باہر ہوگئے۔ ہندو مسلم اتحاد ختم ہوگیا۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں چلیں۔ مسئلہ سوراج اور خلافت بے اثر ہوتا چلا گیا۔ تحریکِ خلافت، جس کا نصب العین عدمِ تشدد برقرار رکھتے ہوئے حصولِ مقصد کی طرف بڑھنا تھا، ختم ہوگیا۔ تحریک تشدد کے راستے پر چل نکلی۔ اور حکومت نے فائدہ اُٹھایا۔

1923ء کے آخر میں جب علی برادران اور دوسرے رہنما آزاد ہوئے، اس وقت کانگریس دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ سوراج پارٹی کا الگ قیام عمل میں آچکا تھا۔ رہنماؤں نے بڑی کوششیں کیں کہ ہندو مسلم اتحاد قائم رہے، مگر کچھ نہ ہوا۔ اسی دوران فروری 1924ء میں مصطفیٰ کمال پاشا کی زیر قیادت ترکی کی قومی مجلس نے سلطان عبدالمجید خاں کو معزول کرکے ملک بدر کردیا۔ اور خلافت کا منصب ختم کردیا۔ اب گویا تحریکِ خلافت بے مقصد ہوگئی تھی، مگر اس کے اجلاس ہوتے رہے۔ علی برادران برابر کوشش کرتے رہے تا آں کہ محمد علی جوہرؒ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد بھی مولانا شوکت علیؒ نے کوششیں کیں، مگر اب ہندوستان میں دوسری تحریکیں زوروں پر تھیں۔ اس لیے خلافت تحریک ختم ہوگئی۔ اور اپنی اماں کے قول کے مطابق حقیقتاً علی برادران نے خلافت تحریک کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کردیا۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شُد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالَم دوامِ ما

☆☆☆☆☆☆☆

www.rahmia.org

حوالہ جات و حواشی

1۔ گیلانی، مناظر احسن، مولانا، ''احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن''، ص170، طبع مکتبہ حمادیہ، کراچی۔ اس کے علاوہ مولانا محمد میاں نے ''علمائے حق'' میں دار العلوم کے قیام کے مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

2۔ یہ تمام تفصیل دائرۃ المعارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب میں ''ترک اور طرابلس'' کے ذیل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ نیز ''تاریخ اقوامِ عالم'' از مرتضیٰ احمد خاں، طبع مجلس ترقی ادب لاہور، ملاحظہ فرمائیں!

3۔ جعفری، رئیس احمد، ''علی برادران''، ص96، طبع لاہور۔

4۔ مدنی، حسین احمد، مولانا، ''سفرنامہ اسیر مالٹا''، ص9، طبع مکتبہ زکریا، لاہور۔

5۔ سندھیؒ، مولانا عبید اللہ، مضمون ''چندہ ہلالِ احمر اور دار العلوم دیوبند''، ماہنامہ ''القاسم'' دیوبند، ص19، ماہِ ذی الحجہ ۱۳۳۰ھ۔ نیز دائرۃ المعارف اسلامیہ، دانش گاہِ پنجاب، عنوان ''محمود حسن''۔

6۔ تفصیل کے لیے دیکھیے! ''نقش حیات'' از مدنی، حسین احمد، مولانا۔ اور ''تحریکِ شیخ الہندؒ'' از محمد میاں۔

7۔ آزاد، ابوالکلام مولانا، ''مسئلہ خلافت و جزیرۃ العرب''، ص134، کلکتہ، البلاغ پریس، 1920ء۔

8۔ عدیل عباسی، قاضی محمد، ''تحریکِ خلافت''، ص69، دہلی، ترقی اردو بورڈ، 1978ء۔

9۔ مسئلہ خلافت، محولہ بالا، ص134۔

10۔ ایضاً، ص38، 235۔

11۔ جوہر، محمد علی، ''خطبۂ صدارت اودھ کانفرنس''، ص38، لکھنؤ، 25 فروری 1921ء۔

12۔ تحریکِ خلافت و History of the non-coaperations and khilafat movement, p-101-3, Bam ford,pc,web publication, 1974.

13۔ تحریکِ خلافت، محولہ بالا، ص119۔

14۔ Independent احمد آباد کے ایڈیٹر تھے۔ 1913ء میں مسجد کان پور کے سلسلے میں مولانا محمد علی جو وفدِ انگلستان لے کر گئے تھے، اس میں شریک تھے۔

15۔ پنجاب سے ان کا تعلق تھا۔ علی گڑھ کے قدیم طلبا میں مشہور تھے۔ بھوپال میں ملازمت کرتے تھے۔ وفد کے سیکرٹری کی حیثیت سے شریک تھے۔

16۔ تحریکِ خلافت، محولہ بالا، ص120۔

17۔ جعفری، رئیس احمد، اوراقِ گم گشتہ، ص57، لاہور، محمد علی اکیڈمی، 1960ء۔

18۔ اوراقِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص194۔

19۔ جعفری، رئیس احمد، ''خطباتِ محمد علی''، ص43، طبع کراچی۔

20۔ خطبات محمد علی، محولہ بالا، ص43۔

www.rahimia.org

21۔ ایضاً، ص83۔
22۔ خطبۂ صدارت اودھ خلافت کانفرنس، محولہ بالا، ص39۔
23۔ اوراقِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص56۔
24۔ ''علی برادران''، ص56۔
25۔ محمد علی، مولانا، تقاریر محمد علی (حصہ دوم)، ص17، میرٹھ، قومی دارالاشاعت، س ن۔
26۔ آزاد، مولانا ابوالکلام، ''قولِ فیصل''، ص44، کلکتہ، البلاغ، پریس، ص1921ء۔
27۔ خطبۂ صدارت دہلی و اجمیر میوارڈ پولیٹیکل کانفرنس، ص18-19، میرٹھ، قومی دالاشاعت، 1920ء۔
28۔ اوراقِ گم گشتہ، محولہ بالا، ص124۔
29۔ تقاریر محمد علی، محولہ بالا، ص17، ص38۔
30۔ آزاد، ابوالکلام، ''خطباتِ آزاد''، ص38، (مرتبہ مالک رام)، نئی دہلی، ساہتیہ اکادیمی، 1974ء۔
31۔ تقاریر محمد علی، اول، محولہ بالا، ص44۔
32۔ محمد میاں، مولانا سید، ''علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے''، مطبوعہ لاہور۔
33۔ خطبۂ صدارت دہلی و اجمیر، محولہ بالا، ص13-14۔
34۔ ایضاً، ص17۔
35۔ History of the non-coaprations, p-70۔

☆☆☆☆☆☆☆

www.rahimia.org

تحریکات

ایشیا کی عہد ساز قیادت (2)

شیخ الہندؒ اور روح عصر

از: مولانا محمد ناصر

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (1851ء تا 1920ء) کی زندگی پر نظر ڈالیے۔ آپ کے افکار و خدمات کے بیان و تجزیے کے کئی انداز ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک انداز یہ ہوگا اور عام طور پر اہلِ قلم اور اصحابِ نظر اسی کو اختیار فرمائیں گے کہ علم و عمل کے مختلف میدانوں میں آپ کے افکار و خدمات کا جائزہ لیا جائے، لیکن تمام معنوں میں آپ کی ذاتِ گرامی ایک ذات تھی کہاں؟ آپ کا وجودِ مقدس و گرامی مرتبت، علم و ادب، فکر و نظر، مذہب و سیاست، ایثار و عمل، اَخلاق و سیرت اور مذہبی علوم و فنون کے مختلف دبستانوں کا ایک دبستان اور سینکڑوں انجمنوں کی ایک انجمن تھا۔ آپ کے وجودِ مقدس سے فیضانِ الٰہی کے سینکڑوں چشمے جاری ہوئے تھے۔ آپ کی ذات گرامی کا ایک خاص دور میں ایک محور ضرور تھا، لیکن اپنے دور میں آپ خود ایک نظامِ رُشد و ہدایت اور مذہب و سیاست کے مرکز و محور تھے۔

آپؒ کی دعوت تعمیرِ فکر سے لے کر انقلاب تک، مسندِ درس و تعلیم اور ذوقِ عمل کی تربیت سے لے کر میدانِ جہاد و عمل تک، تالیف و تدوینِ افکار سے لے کر جہادِ لسانی کے ملی و قومی میدانوں تک، مسلمانوں کی عام اجتماعی زندگی سے لے کر بین الملی سطح تک اور مسلمانوں سے لے کر برادرانِ وطن تک، ملکی حالات سے لے کر بین الاقوامی مسائل تک اور اسلامی دینی دائرے سے لے کر قومی سیاست کے تمام گوشوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ، صرف تفسیر و حدیث و فقہ و اصول منطق اور فلسفۂ حساب اور معقولات ہی کے بہت بڑے عالم نہیں تھے بلکہ ان کو اَدبیاتِ عربیہ و فارسیہ و اُردو، شعر و سخن و اساتذۂ فن کے مقالات و قصائد و غزلیات اور مثنویات وغیرہ اس قدر یاد اور ازبر تھیں کہ سننے والا حیران رہ جاتا اور تعجب کرنے لگتا تھا۔ اسی طرح حضرتؒ کی نظر تاریخ اور سیاسی واقعات پر وسیع اور گہری تھی۔ ہندوستان کی اقتصادی، معاشی، سیاسی، تجارتی، صنعتی، تعلیمی، انتظامی، جنگی وغیرہ معلومات بھی اس قدر تھیں کہ بڑے بڑے ڈاکٹر اور اکنامکس کے پروفیسر، ان تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اخبار بینی اور واقعاتِ عالم پر اطلاع کا بہت شوق تھا۔ بہر حال ان کو انگریزی حکومت اور ہندوستان کے واقعات نے مجبور کیا کہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر انگریزی استبداد و مظالم کا مقابلہ کیا جائے۔ اور کسی قسم کے خطرے کو بھی مرعوب یا متاثر کرنے

www.rahimia.org

کا موقع نہ دیا جائے۔(1)

حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی کو اگر چند سطور میں بیان کیا جائے تو وہ دینی وملی، ملکی وقومی اور بین الاقوامی سیاست، دارالعلوم کی مسندِ درس وتدریس، اصحابِ عمل اور مردانِ کار کی تعلیم وتربیت، جمعیۃ الانصار اور نظارۃ المعارف القرآنیہ کا قیام، ترکی کے لیے ایثارِ وقت ومال، مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا سفر کابل، خود حضرتؒ کا سفر حجاز واسارتِ مالٹا، ریشمی رومال کی تحریک، خلافت کی تحریک اور ترکِ موالات، ہندومسلم اتحاد، علمائے کرام اور گریجوایٹ طبقے کے ربط واتصال پر مشتمل ہے۔(2)

شیخ الہندؒ کا لقب:

جب 15 مارچ 1920ء کو ساڑھے تین سال کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کی مالٹا جیل سے رہائی کا حکم جاری ہوا۔ اور 28 جون 1920ء کو آپ ہندوستان پہنچے۔(3) تو بمبئی کی بندرگاہ پر ہزارہا آزادی کے متوالوں نے آپ کا پُرجوش استقبال کیا۔ اس کے بعد خلافت کمیٹی کی جانب سے آپ کی خدمت بابرکت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اور آپ کو شیخ الہندؒ (The Supreme Leader of India) کا خطاب دیا گیا۔(4) جو اسم گرامی کا ایک جزو بن گیا۔

ہندوستان واپسی کے وقت اگرچہ آپ کی صحت حددرجہ گرچکی تھی لیکن مشاغل کا انہاک آپ کو چین نہ لینے دیتا تھا۔ جسم وجان کو ہلا دینے والی اذیت ناک قید کے بعد آپ کی سوچ اور جذبۂ عمل کیا تھا؟ اس بابت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ''نقشِ حیات'' میں تحریر کرتے ہیں:

> ''حضرت شیخ الہندؒ اس لمبی مدت کی قید کی مشقتیں برداشت کر کے ہندوستان آئے تو ان کے جذبۂ حریت میں کوئی کمزوری یا کمی نہ تھی۔ بلکہ ہندوستانی مارشل لاء رولٹ ایکٹ مجریہ 19 مارچ 1919ء کے کالے قانون (5) کے خلاف 13 اپریل 1919ء کو جلیانوالہ باغ امرتسر میں ایک جلسہ ہوا۔ جس پر انگریز نے گولی چلائی اور چار سو کے قریب لوگ شہید ہوئے۔ یہ اور اس جیسے اور واقعات اور ترکی مملکت کی تقسیم اور معاہدۂ میسورے اور ترکوں کے ساتھ انتہائی بے انصافیوں نے اس آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ بمبئی میں اترتے ہی مولانا شوکت علی مرحومؒ اور خلافت کمیٹی کے ممبروں وغیرہ سے حضرت شیخ الہندؒ کی ملاقات ہوئی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ لکھنؤ سے اور مہاتما گاندھی احمد آباد سے، حضرت شیخ الہندؒ کے استقبال کے لیے تشریف لائے۔ ان سے نیز دوسرے لیڈروں سے خلوت اور جلوت میں حالاتِ حاضرہ پر باتیں ہوئیں۔ اس موقع پر آپ نے عدمِ تشدد کا پروگرام ہندوستان کے آزاد کرانے کے لیے ضروری قرار دیا۔''(6)

www.rahimia.org

اسی طرح جب تحریکِ ترک موالات شروع ہوئی تو آپؒ نے خلافت کمیٹی اور کانگریس کی متعین کردہ راہ کی حمایت میں ایک مفصل فتویٰ دیا۔(7)

حضرت شیخ الہندؒ کو پوری زندگی دینی فکر کے احیا اور آزادیٔ ہند کے مشن سے جو عشق تھا، اس کا ان کے آخری دور کے حوالہ سے مولانا سید محمد میاںؒ نے مؤثر انداز میں نقشہ یوں کھینچا ہے:

حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان تشریف لائے تو مرض الموت کا آغاز تھا۔ آپؒ کو جوڑوں کے درد کا قدیم زمانے سے عارضہ تھا۔ کثرتِ بول کی شکایت بھی پرانی تھی۔ اس پر مالٹا کا سرد موسم اور مزید برآں حضرتِ والا کی شب بیداری، ریاضت اور قلتِ غذا، اس کے ساتھ پیرانہ سالی اور پھر ترکوں کی شکست اور اپنی جدوجہد کی ناکامی کا صدمہ، ان تمام اسباب کی بنا پر گویا مرض الموت کا سلسلہ مالٹا ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ پھر تقریباً تین ماہ تک راستے کی مشقت اور ہندوستان پہنچنے کے بعد خلقت کا ہجوم، تحریک کی ترقی، مشاغل کی کثرت وغیرہ یہ سب چیزیں اضافۂ مرض کا سبب بنتی ہیں۔ انتہا یہ کہ آپ کو ٹی بی ہو گئی، مگر درحقیقت اس شیخ طریقت اور شیخ سیاست کی ہمت و استقلال، ہر ایک مسلمان بلکہ ہر ایک انسان کے لیے سبق آموز ہے کہ تپ دق کی آخری سٹیج سے چلنا پھرنا تو درکنار بیٹھنا بھی ممکن نہیں، مگر اس حالت میں بھی تحریک کی قیادت کی جا رہی ہے۔ اجلاسوں کی شرکت کے لیے سفر ہو رہا ہے۔ صدارت فرمائی جا رہی ہے۔ العظمة لله، عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ بسترِ مرگ پر ایک شخصِ فانی کا یہ بے پناہ جذبۂ عمل۔(8)

شیخ الہندؒ کی آخری دور کی حکمت عملی:

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے آخری دور میں تحریکِ آزادی کی حکمتِ عملی کو بالکل ایک نیا رخ دیا، جو اسلام کے عہدِ اول کی پیروی بھی تھی۔ اور روح عصر کا تقاضا بھی تھا۔ آخری دور کی حکمت عملی میں چار پہلو نمایاں ہیں:

1۔ عدم تشدد کی حکمتِ عملی۔
2۔ قومی سیاسی حکمتِ عملی۔
3۔ عصری تعلیمی اداروں کے نوجوانوں کی تربیت اور ان کا قائدانہ کردار۔
4۔ سماج بیزار مذہبیت کی نفی۔

1۔ عدم تشدد کی حکمت عملی:

مالٹا قید سے پہلے حضرت شیخ الہندؒ تحریکِ آزادی کو کچھ عرصہ مسلمہ بین الاقوامی اصول کے تحت اس دور کی عالمی اسلامی طاقت کے تناظر میں مسلح جدوجہد کے طریقے پر چلاتے رہے تھے، لیکن مالٹا سے واپسی کے وقت حالات بدل چکے تھے۔ اب مسلح جدوجہد کے طریقے کو اختیار کیے رکھنا نقصان دہ تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ جنگ

عظیم سے فارغ ہو چکا تھا۔ اور برطانوی حکام کے تکبر اور غرور کا پارۂ حرارت انتہا کو پہنچا ہوا تھا، جس میں امریکہ کی ہمنوائی شامل تھی۔ انہیں یقین تھا کہ تشدد کے ذریعے ہندوستانی عوام کے جذبۂ آزادی اور سیاسی سوچ کو وہ دبالیں گے، جب کہ ہندوستانی لوگ معاشی لحاظ سے پہلے کی نسبت بہت دباؤ میں تھے۔ سابقہ حکمتِ عملی میں ترکی سلطنت کے تعاون کا عنصر بھی شامل تھا، جو کہ اب موجود نہ رہا تھا۔ اس بنا پر اسارتِ مالٹا کے بعد اگلے دور کی حکمت عملی طے کرتے ہوئے حضرت شیخ الہندؒ نے عدمِ تشدد کو بنیاد بنایا، جس کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کے مکی دور میں ملتی ہے۔ ان دنوں آپ سے جو اہم قومی لیڈر ملے، جن میں مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مسٹر گاندھی قابل ذکر ہیں، ان کو بھی آپ نے اپنا ہمنوا پایا۔ یہ سب رہنما عدم تشدد کی حکمت عملی پر یکسو ہوگئے۔ اس حوالے سے بھی آپؒ نے قائدانہ کردار ادا کیا، جس سے تحریکِ مزاحمت کو زبردست تقویت ملی۔ عدمِ تشدد کی حکمتِ عملی آپ نے کیوں اختیار کی؟ اس حوالے سے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس دوئم میں حضرت شیخ الہندؒ کا صدارتی خطبہ وجہ جواز بیان کرتا ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں:

> ''آج احتجاج اور مطالبۂ حقوق کے میدان صرف مظاہروں کے پلیٹ فارم ہیں۔ خلوتیں اور تنہائی کی راتیں اس کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اگر موجودہ زمانے میں توپ، ہوائی جہاز کا استعمال دشمنوں کے مقابلے کے لیے جائز ہوسکتا ہے (باوجودیکہ قرونِ اولیٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں) تو مظاہروں اور قومی اتحادوں اور متفقہ مطالبوں کے جواز میں بھی شک نہ ہوگا، کیوں کہ موجودہ زمانے میں ایسے لوگوں کے لیے جن کے ہاتھ میں بندوق، ہوائی جہاز نہیں، یہی چیزیں ہتھیار ہیں۔'' (9)

عدمِ تشدد کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ہندوستان کے بابائے قوم مہاتما گاندھی نے بھی کہا تھا کہ: ''عدمِ تشدد بزدل آدمی کا کام نہیں، یہ بہادروں کا کام ہے۔'' (10)

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے آخری دور میں سابقہ تجربات کی روشنی میں نیز تبدیل شدہ عالمی منظرنامے میں کہ قومی بنیادوں پر ریاستیں وجود پذیر ہورہی ہیں، آئندہ کے لیے عدمِ تشدد کی حکمت عملی لازم قرار دے دی تھی۔ لہٰذا اس تناظر میں اسلام کے نام پر موجودہ دور کی کسی تشدد پسند تحریک کو تحریکِ شیخ الہندؒ سے منسوب کرنا حقائق کو مسخ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی تحریکات مصر کی اخوان المسلمون اور ان کی ہمنوا جماعتوں کی فکر سے زیادہ متاثر ہیں، جن کو قومی آزادی کی تحریکات کے بالمقابل پروان چڑھایا گیا۔

تشدد پسندی کو فروغ دینے والے زعما کو، باچہ خان کے اس تبصرے پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''انگریز کہا کرتے تھے: ''عدمِ تشدد پر کاربند پٹھان، تشدد کے دیوانے پٹھانوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔'' (11)

یہی سبب ہے کہ حال ہی میں (2008ء) رابطہ مدارس اسلامیہ دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی، ملت کے تمام مکاتبِ فکر کے نمائندوں کی دہشت گردی مخالف کل ہند کانفرنس میں ایک متفقہ قرارداد کے ذریعے

www.rahimia.org

ہر قسم کے تشدد اور دہشت پسندی کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی کہ اسلام ہر قسم کے تشدد اور دہشت گردی کا شدید مخالف ہے۔ اس نے ظلم و تعدی، زور زبردستی، فتنہ و فساد، قتل و خون ریزی، بدامنی و شرانگیزی کو سخت گناہ اور بھیانک جرم قرار دیا ہے۔ الغرض حضرت شیخ الہندؒ کے نام لیواؤں کو اپنا طرزِ فکر و عمل، حضرت کی اعلیٰ سوچ کے مطابق بنانے پر اپنی توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ اگر وہ ان کے آزادی پسند مشن سے مناسبت رکھتے ہیں۔

2۔ قومی سیاسی حکمت عملی:

تحریکِ ریشمی رومال کی کام یابی کا بڑا انحصار بیرونِ ہند بالخصوص سلطنتِ عثمانیہ کی اخلاقی اور عسکری حمایت پر تھا۔ لیکن جب انگریز نے سلطنتِ عثمانیہ کو تارتار کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد کا آغاز کیا۔ اور شریفِ مکہ کو ساتھ ملا کر مرکزِ خلافت سے بغاوت کروادی تو ترکی کے لیے اپنے حالات کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ چناں چہ دنیا کے بدلے ہوئے حالات کے تناظر میں حضرت شیخ الہندؒ اس نتیجے پر پہنچے کہ اب ہمیں اپنی قومی آزادی کی جنگ، اپنے بل بوتے پر لڑنی ہوگی۔ اب باہر سے کوئی ہماری مدد کو نہ آسکے گا۔

اس صورتِ حال کو پہلی جنگِ عظیم نے پیدا کیا تھا۔ اب ہر قوم اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی تھی۔ کیوں کہ اس جنگ عظیم کے پیچھے سامراجی ممالک کا بڑا مقصد خطوں اور جغرافیوں کی بندربانٹ تھا۔ اور وہ ایشیا، افریقہ پر پل پڑے تھے۔ ایسے عالم میں کسی ملک کے لیے دوسروں کی مدد کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ اس بنا پر شیخ الہندؒ کی نگاہِ بصیرت ترکی کو پہلے کی سی قوت کے ساتھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ ترکی خلافت اپنے آخری دموں پر تھی اور وہ اپنا بین الاقوامی کردار ادا کرنے کے لائق نہ رہی۔ اقوام اور ممالک کے باہمی رشتے ایک نئے سانچے میں ڈھلنے جا رہے تھے۔ اس بنا پر ہندوستان اور ترکی خلافت کا پُرانا باہمی رشتہ قائم نہ رہ سکتا تھا۔ ان بدلے ہوئے حالات میں ترکی، ہندوستان کی پشت پر کھڑا نہ ہوسکتا تھا۔ یہ سب تغیراتِ زمانہ شیخ الہندؒ کی نگاہ میں تھے۔ بعد کے حالات نے شیخ الہندؒ کی رائے پر صاد کردیا۔ ترکی کے حصے بخرے کردیے گئے۔ اسی کے ساتھ بعد کے حالات نے دوسرے ممالک کے مسائل میں مداخلت کو بین الاقوامی جرم قرار دے دیا۔ اس بنا پر ضرورت تھی کہ تحریکِ آزادی کو خالص قومی بنیادوں پر چلایا جائے۔ اس کے لیے آپؒ کے سامنے رسول اللہ ﷺ کے مدنی دور کا میثاق بطورِ نمونۂ عمل موجود تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ، جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاسِ دوم میں اپنی اختتامی تحریر میں فرماتے ہیں کہ:

> ''کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کی ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد (آزادی) کے حصول میں مؤید (معاون) بنادیا ہے۔ اور میں ان دونوں قوموں کے اتفاق و اجتماع کو بہت ہی مفید اور منتج (نتیجہ خیز) سمجھتا ہوں۔ اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائدین (رہنماؤں) نے کی ہے اور کر رہے ہیں۔ اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حال اگر اس

کے خلاف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو آئندہ ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ ادھر دفتری حکومت (انگریز) کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا۔ اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بداعمالیوں سے حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں عنصر بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو (بھی) ملا کر تینوں اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم (جیسے انگریز اور آج کل امریکہ) خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو، اِن اقوام کے اجتماعی نصب العین کو اپنے جبر و استبداد سے شکست کر سکے (دے سکے) گی۔'' (12)

گویا حضرت شیخ الہندؒ نے مذہب کے گروہی اور تقسیم انسانیت پر مبنی نظریے کی نفی کر کے اسلام کے انسان دوست تصور پر مبنی قومی حکمت عملی کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ اور یوں اس سوچ کی نفی کر دی جو موجودہ دور میں سیاسی مذہب کہلاتا ہے، جس نے معاشرے میں تقسیم، تشدد، دہشت گردی اور گروہیت کو فروغ دے کر اسلام کے روشن چہرے کو دھندلانے کی سعی نامشکور انجام دی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی نظر میں قومی ہم آہنگی اور سماجی مفاہمت کی حکمتِ عملی کو محض سیاسی داؤ پیچ تصور کرنے کی بجائے پائیدار بنیادوں پر قائم رہنا ضروری ہے۔ چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

''میں یہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ خوش گوار اور پائیدار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دل نشین کر لیجیے۔ اور وہ حدود، وہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے، جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی اُمور میں کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے۔ اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے، جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔''

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں، لیکن محکموں اور ابوابِ معاش (سماجی و معاشی معاملات) میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔''

حضرت شیخ الہندؒ نے مزید فرمایا:

''اگر فرض کرو، ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیئے یا مسلمان ہندو کی ارتھی کو کندھا نہ دے تو یہ ان دونوں کے اتفاق کے لیے مہلک نہیں۔ البتہ ان دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائیاں اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظر میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں۔ اتفاق کے حق میں سمِ قاتل (جان لیوا زہر) ہیں۔'' (13)

www.rahimia.org

3۔ عصری تعلیمی اداروں کے نوجوانوں کی تربیت اور ان کا قائدانہ کردار:

برعظیم ہند پر قبضے کے بعد انگریز نے کئی ایسی تدابیر اختیار کیں، جس نے اجتماعی سوچ اور قومی وحدت کو بہت نقصان پہنچایا۔ اپنی حقیقی مخالف قوت جماعت علمائے حق کو غیر مؤثر کرنے کے لیے انگریز نے گریجویٹ نوجوانوں کو علمائے حق سے متنفر اور دور کرنا شروع کر دیا۔ اور بقول ایرانی سپریم لیڈر سید علی خامنہ ای:

''انگریز نے ہندوستان میں اسلام کے حقیقی مبلغ دارالعلوم (دیوبند) کے مقابلے میں مغربی رُجحانات والا اسلامی مدرسہ (علی گڑھ) قائم کیا۔'' (14)

یہ صورتحال برقرار رہتی تو مستقبل میں قومی آزادی کی تحریک کی کام یابی کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس دوری اور منفیّت کا ختم کیا جانا ضروری تھا۔ اسی بنا پر حضرت شیخ الہندؒ کی حکمتِ عملی آغاز سے یہ رہی کہ جدوجہدِ آزادی میں علما کے شانہ بشانہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو شامل ہونا چاہیے۔ چناں چہ ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ، حکیم اجمل خاںؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلوؒ اور خان عبدالغفار خانؒ جیسے لوگ آپ کی جدوجہد کے ساتھی رہے۔ حتیٰ کہ جمعیۃ الانصار کے اجتماعِ عام میں آپ کی دعوت پر علی گڑھ کالج کے اکابر نے شرکت کی تھی مگر اب حالات اس سے کہیں آگے کا تقاضا کر رہے تھے۔ اور شیخ الہندؒ اپنے نورِ فراست سے دیکھ رہے تھے کہ آج کے دور کی اہم قوت کالج کے گریجویٹ ہیں۔ اور مستقبل میں نظاموں کے بنانے اور بگاڑنے میں ان کا کلیدی کردار ہوگا۔ اس بنا پر آپ اس طاقت کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ان نوجوانوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے طریقے ڈھونڈنے شروع کیے۔ چناں چہ جب تحریکِ ترکِ موالات کا اثر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا پر پڑا تو انھوں نے ایک آزاد نیشنل یونیورسٹی قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور شیخ الہندؒ کو اس کا صدر بنانے پر اصرار کیا تو حضرت شیخ الہندؒ نے اس دعوت کو بلاتأمل قبول کر لیا۔ اور حضرت شیخ الہندؒ باوجود سخت علالت اور نقاہت کے 29 اکتوبر 1920ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاح کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے۔ بیماری کی بنا پر خدام نے شرکت سے روکنا چاہا تو فرمایا کہ:

''اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو ضرور شریک ہوں گا۔'' (15)

چناں چہ حضرت شیخ الہندؒ علی گڑھ اس حالت میں تشریف لے گئے کہ ڈولی میں پڑ کر جلسہ گاہ تک پہنچے۔ چند منٹ بیٹھ کر خطاب کرنا بھی مشکل تھا۔ مختصر سا خطبہ صدارت املا کروایا، جسے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھ کر سنایا۔ اس خطبے کا ایک ایک لفظ آپ کی سیاسی بصیرت، دور اندیشی اور ملی بہی خواہی پر گواہ اور آپ کی پُرعزم سوچ کا آئینہ دار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خطبے کے الفاظ محض مبارک جذبات کا اظہار نہیں بلکہ اگلے دور کی حکمت عملی کے خدوخال متعین کر رہے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کے خطبۂ صدارت کے چند الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔''

www.rahimia.org

حضرت شیخ الہندؒ کی سوچ اور طرزِ عمل کا اثر ان طلبا اور انتظامیہ پر ایسا ہوا کہ آج تک اس گہری عقیدت اور محبت کی ایک نشانی آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ چناں چہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی ویب سائٹ کے سرورق پر پہلا نمایاں نام حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کا ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

درد کے غم خوار، کالجز کے نوجوان:

حضرت شیخ الہندؒ اپنے خطبے میں مزید فرماتے ہیں:

''اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم، سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا۔ اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔ کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں۔ اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتائیں، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔

دوش دیدم کہ ملائک درمیخانہ زد — گل آدم بسر شتد و بہ پیمانہ زدند
ساکنان حرم سرعفاف ملکوت — بامن راہ نشین بادہ مستانہ زدند
شکرایزد کہ میان من واوصلح فتاد — حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند
جنگ ہفتاد و دوملت ہمہ راعذر — چوں نہ دیدند حقیقت راہ افسانہ زدند

گزشتہ رات میں نے دیکھا کہ فرشتے مے خانے میں باتیں کررہے تھے۔ آدمی کی مٹی گوندھ رہے تھے۔ اور اس کا پیمانہ بنارہے تھے۔ پاک دامنی کے رازداں حرم کے باسی فرشتے میرے ساتھ راہ پر بیٹھے شراب مستی چھلکا رہے تھے۔ شکر ہے خدا کا کہ اس نے میرے اور ان کے درمیان صلح کرادی۔ چناں چہ حوریں رقص کرتے ہوئے شکرانے کے طور پر ساغر اُنڈیل رہی تھیں۔ بہتر فرقوں کی لڑائی کا بہانہ رہنے دو۔ جب لوگ حقیقت نہیں دیکھتے تو افسانے کے راستے پر چل پڑتے ہیں (یعنی مدرسہ اور کالج کا اختلاف محض ایک افسانہ ہے۔ ورنہ یہ دونوں اعلیٰ مقاصد کے لیے شیر وشکر ہوجاتے ہیں)۔'' (16)

آج یہ تقاضہ شدت سے اُبھر رہا ہے کہ ہمارے مذہبی طبقے کے زعما، حضرت شیخ الہندؒ کے ان خیالات کی روشنی میں اپنے جاری طرزِ عمل کا جائزہ لے کر عصری حکمتِ عملی کی طرف توجہ دیں۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

www.rahimia.org

4۔ سماج بیزار مذہبیت کی نفی:

دین حق جامع تصورِ حیات کا حامل ہونے کی بنا پر دین و دنیا دونوں میں بھرپور، فعال اور کام یاب طرزِ عمل اپنانے کو پسند کرتا ہے۔ قرآن حکیم اور سیرتِ طیبہ میں جہاں اللہ اور اس کے بندے کے درمیان مضبوط رشتے کے قیام پر رہنمائی ملتی ہے وہیں انسانوں کے باہمی تعلقات، معاملات اور حقوق کی ادائیگی پر بھی برابر زور دیا گیا ہے۔ سماجی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے فرار کی راہ اختیار کرنے والوں کو دین اسلام میں ناپسند کیا گیا ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ظلم پسند نظاموں میں ردِّعمل سے بچنے کے لیے حکمرانوں کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر فرد کو اس کی ذات کے خول میں بند کر دیا جائے۔ اس کو خود غرض بنا کر اجتماعی ذمہ داریوں کے نبھانے سے باز رکھا جائے۔ اور مذہب کا ایسا تصور پیش کیا جائے، جو اس مذہب کے حامل لوگوں کو چند مذہبی اعمال تک محدود رکھ کر اسی مذہبی حیثیت میں مطمئن رکھنے کے ساتھ، موجود باطل اور ظالم نظام کے مقابل جدوجہد سے کنارہ کش اور بیگانہ رکھے۔ یہ صورتِ حال حکمران طبقے کے لیے فائدہ منداور دین کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ اس لیے ہر دور کے علمائے حق حکمرانوں کی سازشوں، ایسی اجتماعیت گریز سوچ اور جدوجہد سے جی چرانے والے لوگوں سے مخلوق کو آگاہ اور متنبہ کرتے رہتے ہیں۔

برعظیم پاک و ہند میں انگریز نے اپنے ظلم کے شکنجے کو مضبوط رکھنے کے لیے ایسی سوچ کو رواج دیا، جو ذاتی نیکی اور انفرادیت پسندی پر مبنی ہو۔ اس سوچ اور رویے کا فائدہ سراسر انگریز کو تھا۔ اور جدوجہدِ آزادی میں سرگرم علمائے ربانی کو مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا تھا۔ اس لیے شیخ الہندؒ نے حقیقی صورتِ حال کو واضح کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ چناں چہ جمعیت علمائے ہند کے اجلاس دوئم 21,20,19 نومبر 1920ء کے صدارتی خطبے میں شیخ الہندؒ نے جمعیت کے مقاصد کی وضاحت اور بھرپور تائید کرتے ہوئے مذہب کے قنوطی تصور (سماجی کردار سے عاری اور تبدیل احوال سے مایوسی پر مبنی تصور) کی سختی سے نفی کی۔ جس کے تحت مذہب صرف چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اور معاشرتی معاملات سے الگ تھلگ اور بنیادی اصلاحِ احوال سے مایوس ہو کر اپنے خول میں بند رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ چناں چہ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا:

> ''اسلام صرف عبادات کا نام نہیں، بلکہ وہ تمام مذہبی، تمدنی، اَخلاقی، سیاسی ضرورتوں کے متعلق ایک کامل و مکمل نظام رکھتا ہے، جو لوگ کہ زمانۂ موجودہ کی کشمکش میں حصہ لینے سے کنارہ کشی کرتے ہیں۔ اور صرف حجروں میں بیٹھ رہنے کو اسلامی فرائض کی ادائیگی کے لیے کافی سمجھتے ہیں، وہ اسلام کے پاک و صاف دامن پر ایک بدنما دھبہ لگاتے ہیں۔ ان کے فرائض صرف نماز، روزے میں منحصر نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ہی اسلام کی عزت برقرار رکھنے اور اسلامی شوکت کی حفاظت کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی ہے۔''

آپؒ نے مزید فرمایا:

www.rahimia.org

جماعتِ علما جو حقیقتاً مسلمانوں کے مذہبی قائدین ہیں، ان کا فرض ہے کہ اس وقت موقعے کی نزاکت اور اہمیت کو نظرانداز نہ کریں۔ آپس کے نزاع اور اختلاف میں پڑکر اصل مقصود کو خراب نہ کریں۔ ورنہ مسلمانوں کی خرابی اور بربادی کی تمام تر ذمہ داری انہیں پر عائد ہوگی۔ علمی تدقیقات کے لیے آپ کے واسطے بہت سے میدان کھلے ہوئے ہیں۔ عبادت و ریاضت کے لیے بہت سی راتیں آپ کو بلاشرکت غیرے حاصل ہیں، مگر جو کام کہ جبل اُحد اور میدانِ بدر میں ہوا، وہ مسجدِ نبویؐ جیسی مقدس جگہ کے مناسب نہ تھا۔'' (17)

حضرت شیخ الہندؒ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تاسیسی اجلاس میں قنوطی مذہب کے حوالے سے تشکیل پانے والے رویوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بہت سے نیک بندے ہیں، جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا اُٹھو! اور اس امتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہوجاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب وضرب کا۔

حال آں کہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے۔ اور دنیا کی متاعِ قلیل خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ چناں چہ اس قسم کے مضمون کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اشارہ فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ
فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ
خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝
اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ (18)

''کیا تم نے ان لوگوں کی طرف نظر نہیں کی، جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ کو روکو۔ اور نماز پڑھتے رہو۔ اور زکوۃ دیتے رہو۔ پھر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو یکا یک ان میں کا ایک فریق ڈرنے لگا آدمیوں سے، خدا کے برابر یا اس سے بھی زیادہ۔ اور کہنے لگا کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا۔ اور کیوں تھوڑی مدت ہم کو اور مہلت نہ دی۔ کہہ دو کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت اس شخص کے لیے بہتر ہے، جس نے تقویٰ اختیار کیا۔ اور تم پر ایک تاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ جہاں کہیں بھی تم ہو موت تم کو آدبائے گی۔ اگرچہ تم نہایت مستحکم قلعوں میں ہو۔''

جس دور اور جن لوگوں کے سامنے حضرت شیخ الہندؒ نے یہ کلمات کہے، ان پر کیا اثرات مرتب ہوئے، اسے تو وہی جانیں۔ کیا یہ کلماتِ مبارکہ موجودہ حالات میں بھی ہر سلیم الفطرت انسان کے لطیف احساسات کو مہمیز نہیں دے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری موجودہ رسمی مذہبی سوچ میں ارتعاش اور تبدیلی پیدا کرنے کے لیے یہ الہامی الفاظ غور و فکر کا سامان لیے ہوئے ہیں۔

جمعیت علمائے ہند کے اجلاس کے اختتامی کلمات میں جمعیت کے اغراض و مقاصد کی توثیق کرتے ہوئے شیخ الہندؒ مزید فرماتے ہیں:

> ''مجھے یہ معلوم ہو کر نہایت مسرت ہوئی کہ جسم قوم کی روح جماعت علما نے بعض سیاسی امور میں پھر ایک مرتبہ اپنی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہے، جن میں وہ بالکل مردہ سمجھی جا رہی تھی۔ اور جن میں اگر وہ مردہ ثابت رہتی تو اسلامی عزت و وقار کا بالکل ہی خاتمہ تھا۔ آپ رنجیدہ نہ ہوں تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا علم وتدین، (19) اگر اب بھی عالم اسلام کے خوف ناک مصائب سے آنکھ بند کیے رکھنے کی اجازت دیتا تو آج دنیا ہماری غیرتِ ایمانی اور شرافتِ انسانی دونوں کے بیک وقت دفن کیے جانے پر ماتم کناں ہوتی۔'' (20)

شیخ الہندؒ کی حکمتِ عملی کے یہ چار نمایاں پہلو جو اوپر کی سطور میں ذکر ہوئے، شیخ الہندؒ کے آخری دور کے فکر و عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تفصیل سے یہ بات عیاں ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں دورانِ تعلیم شیخ الہندؒ نے اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے جذبۂ جہاد کی جو امانت حاصل کی تھی، اس کی حفاظت، اشاعت اور عملی تشکیل کے لیے آپ اپنی زندگی کے آخری سانسوں تک کوشاں رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حالات کے جبر نے آپ کے منصوبوں کی راہ میں بے شمار پتھر اور کانٹے بچھائے، مگر آپؒ حالات کی ناموافقت کا عذر کر کے تھک کر بیٹھ نہیں گئے۔ بجا کہ تحریک ریشمی رومال کا منصوبہ اپنی اصل حالت میں حالات کے بدل جانے سے اگرچہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا، لیکن تحریک شیخ الہندؒ بہر حال جاری رہی۔ البتہ اس کی نوعیت بدل گئی۔ پہلے یہ قومی آزادی کے لیے خلافتِ عثمانیہ کے پس منظر میں قومی عسکری تحریک تھی۔ منصوبے کی ناکامی کے بعد ایک قومی سیاسی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔ اور اس کے ممبران جمعیت علمائے ہند، خلافت کمیٹی، مجلس احرار جیسی تنظیموں میں شریک ہو کر آزادی کی سرفروشانہ جدوجہد جاری کیے رہے۔ (21)

شیخ الہندؒ کا وصال:

حضرت شیخ الہندؒ جسمانی طور پر نحیف و نزار اور کمزور تو تھے ہی، مزید برآں مالٹا کے موذی قید خانے کے قیام نے آپ کی رہی سہی صحت پر بھی اثر ڈالا تھا۔ آپ 28 جون 1920ء کو رہا ہو کر جب واپس ہندوستان تشریف لائے

تو اس وقت بھی آپ کے جسم میں آزادی کی آگ شعلہ زن تھی۔ اور اس سخت تکلیف کے باوجود آپ ہر اُس کام کو انجام دینے کو تیار تھے، جو آزادی کی تحریک میں کسی بھی طرح معاون ہو۔ اس واحد غرض کے لیے آپ نے جامعہ ملیہ کی تاسیس میں اور جمعیت علمائے ہند کے اجلاس دوئم میں شرکت فرمائی تھی، لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا کہ مالٹا سے واپسی کے صرف چھ مہینے بعد یہ عظیم لیڈر اور ہندوستانی قوم کا قائد جلیل 30 نومبر 1920ء بروز منگل یعنی جمعیت علمائے ہند کے اجلاس کے صرف 9 دن بعد ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ کے مکان پر یہ کہتے ہوئے اس دارِفانی سے رخصت ہوگیا کہ:

''مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں۔ تمنا یہ تھی کہ میدانِ جہاد ہوتا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے جرم میں میرے ٹکڑے کیے جاتے۔''

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں:

''اس کے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا۔ آٹھویں مرتبہ آواز بند ہوگئی۔ پاس بیٹھے مفتی کفایت اللہؒ اور دیگر سورۃ یٰسین پڑھ رہے تھے۔ جب یہ لوگ اخیر سورۃ پہنچے تو حضرتؒ نے ذرا آنکھ کھولی۔ اور تصدیق قلبی (دل کے ایمان) کی تائید کے لیے زبان کو حرکت دی۔ اور سورۃ کے آخری کلمات اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے) کی آواز پر قبلہ رُخ ہوکر ہمیشہ کے لیے آنکھ بند کرلی۔ اور سہولت سے سانس منقطع ہوگیا۔ اور آپ کی روحِ مقدس تمام اہل اسلام کو یتیم و بے کس چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئی اور رفیق اعلیٰ سے جا کر مل گئی۔'' (22)

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

سیاسی بصیرت وخدمات کا اعتراف:

شیخ الہندؒ کے وصال مبارک پر ملک اور بیرون ملک کے اکابر نے آپ کی سیاسی بصیرت وخدمات کا اعتراف کیا۔ ان تمام بیانات کا احاطہ گو ممکن نہیں، صرف چند ایک پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ آزاد افغانستان کے پہلے حکمران امیر امان اللہ خانؒ نے افغانستان کی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''محمود حسن ایک نور ہے، جس کی روشنی میں ہم بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں۔''

امیر امان اللہ خانؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کی وفات پر نہایت اخلاص سے بے نظیر شان کے ساتھ مجلس فاتحہ خوانی منعقد فرمائی۔ اور اس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''مولانا محمود حسن یک کار را شروع کردند من اورا پورا میکنم''۔

''مولانا شیخ الہندؒ نے جس کام کو شروع کیا تھا، میں اسے پورا کروں گا۔''

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے ساتھ سفر کابل میں شریک اور اس فاتحہ خوانی میں موجود مجاہدِ آزادی حاجی فیض محمد خان

اس فاتحہ خوانی کے احوال میں لکھتے ہیں: ''فاتحہ خوانی میں دعا کے بعد شاہ امان اللہ خانؒ نے اٹھ کر تقریر کی۔ انھوں نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''شیخ الہندؒ کی وفات سے مجھے سخت صدمہ پہنچا ہے۔ اور آپ اور دوسرے علما، جن کا مولانا محمود حسنؒ سے گہرا تعلق تھا، میرے دلی ہمدردی کے مستحق ہیں۔ وہ اسلام کی عمارت کے ایک مضبوط ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے، وہ شاید کبھی پُر نہ ہو سکے۔'' (23)

آزاد ہندوستان کے پہلے نائب وزیر اعظم اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس سوئم لاہور (18 تا 20 نومبر 1921ء) میں خطبۂ صدارت کے دوران حضرت شیخ الہندؒ کی وفات پر کہا:

''ان کی وفات بلاشبہ ایک قومی ماتم ہے۔ مولانا مرحوم ہندوستان کے گزشتہ دورِ علما کی آخری یادگار تھے۔ ان کی زندگی اس عہدِ حرمان وفقدان میں علمائے حق کے اوصاف وخصائل کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمالِ حقہ میں بسر ہوا وہ علمائے ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ستر برس کی عمر میں جب ان کا قد ان کے دل کی طرح اللہ کے آگے جھک چکا تھا۔ بیت اللہ کے بالکل قریب گرفتار کیے گئے۔ اور جزیرۂ مالٹا میں نظر بند رہے۔ یہ مصیبت انھیں صرف اس لیے برداشت کرنا پڑی کہ اسلام وملت اسلام کی تباہی وبربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کر سکا۔ اور انھوں نے حق کے دشمنوں کی خواہشات کی تسلیم واطاعت سے مردانہ وار انکار کر دیا۔ درحقیقت انھوں نے علمائے حق وسلف کی سنت زندہ کر دی۔ اور علمائے ہند کے لیے اپنی سنت حسنہ یادگار چھوڑ گئے۔ وہ اگرچہ اب ہم میں موجود نہیں ہیں، لیکن ان کی روحِ عمل موجود ہے۔ اور اس کے لیے جسم کی طرح موت نہیں۔'' (24)

جماعت شیخ الہندؒ:

شیخ الہندؒ کی وفات کے وقت ہندوستان، بلکہ پوری دنیا میں کئی قسم کی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ ان تبدیلیوں کے پیچھے پہلی جنگ عظیم کا بڑا کردار ہے، جو دراصل مغربی ممالک کی حرص وآز کی آگ کا اظہار تھا۔ مغربی ممالک دنیا کی لوٹ کھسوٹ کے لیے علاقوں کی نئی بندر بانٹ کرنا چاہتے تھے۔ اس زمانے میں تمام براعظموں کے جغرافیوں میں اہم تبدیلیاں اسی کا نتیجہ تھیں۔ اور مشرقِ وسطیٰ میں کراچی جتنے علاقے پر مشتمل ممالک کا قیام اسی شیطانی شرارت کا شاخسانہ ہے۔ اسی کے بعد مسلمانوں کے مرکزِ خلافت ترکی کے حصے بخرے کیے گئے۔ جس کے اثرات پوری دنیا بالخصوص مسلمانوں پر بہت زیادہ پڑے۔ مسلمانوں کی اجتماعیت منتشر ہو گئی۔ یہ واقعات وحوادث جو دنیا میں پیش آئے، ان کے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اہم اثرات مرتب ہوئے۔ یہ صورتِ حال نئی حکمت عملی بنائے جانے کا تقاضا کر رہی تھی۔

www.rahimia.org

حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی تربیت نے علما اور گریجوایٹس میں ایک ذی شعور حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اور حضرت شیخ الہندؒ کے علاوہ آپ کے تلامذہ و رفقا میں کئی شخصیات نے سیاسی فکر و عمل میں امتیاز اور رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ نمایاں مثالوں میں مفتی کفایت اللہؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور انصاریؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد صادق سندھیؒ، مولانا عزیر گلؒ، مولانا عبدالرحیم پوپلزئیؒ اور ایسے کئی نام لیے جاسکتے ہیں۔

ان میں سے اکثر حضرات تو آپ کے شاگرد اور تحریکِ آزادی کے عظیم رہنماؤں میں سے ہیں، لیکن اس عہد کے اکابر سیاست دانوں میں سے کون ہے، جو شیخ الہندؒ کے سیاسی افکار سے مستفید نہیں ہوا۔ اور جس نے آپ کے عمل و سیرت سے عزیمت و استقامت کا سبق نہیں سیکھا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ اور خان عبدالغفار خانؒ تو آپ کے ہاتھ پر بیعت جہاد و اصلاح کر چکے تھے۔ حکیم اجمل خانؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، مولانا شوکت علیؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلوؒ وغیرہ کون ہے، جو وقت کے اس سیاسی سورج کے نظامِ کشش سے آزاد ہو۔ اور اپنا الگ مرکزِ ثقل رکھتا ہو۔

اگرچہ علومِ دینی میں دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں بعض دوسرے مراکزِ نور بھی تھے۔ اور ان کے اپنے الگ الگ نظام قمری تھے، لیکن سیاسی روشنی وہ اسی چشمۂ نور سے حاصل کرتے تھے۔ سیاست میں انھیں جو پیشوائی اور مقتدائی کا مقام حاصل تھا، وہ انہیں شیخ الہندؒ کی وجہ سے حاصل ہوا تھا۔ فرنگی محل کے شیخ وقت مولانا عبدالباریؒ، آپؒ کی بزرگ شخصیت اور سیاسی رہنمائی کے معترف و مداح تھے۔ مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ نے تبلیغی جماعت کے بانی اور امیر کی حیثیت سے عالم گیر شہرت پائی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے دستِ حق پر بیعت جہاد کر چکے تھے۔ علمائے لاہور اور لدھیانہ میں سے اکثر ایک الگ فقہی مسلک رکھنے کے باوجود سیاسی میدان میں ان کے رہنما بھی حضرت شیخ الہندؒ تھے۔ (25) حاجی ترنگ زئیؒ اور ان کے رفقا میں سے بالخصوص مولانا سیف الرحمٰنؒ، جو قندھاری افغان ہیں، جیسے غیور مجاہد جنھوں نے آزاد قبائل علاقہ یاغستان میں تحریک آزادی کو جاری رکھا۔ یہ سب شیخ الہندؒ کے چشمۂ فیض سے ہی سیراب ہوئے ہیں۔

جماعتِ شیخ الہندؒ میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا نام نامی نمایاں اور امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ آپؒ ہمیشہ جماعت شیخ الہندؒ میں کلیدی کردار کے حامل رہے ہیں۔ چنانچہ جمعیۃ الانصار کی نظامت سے لے کر حضرت شیخ الہندؒ کے ایما پر نظارۃ المعارف القرآنیہ کے نام سے ادارہ کا قیام اور شیخ الہندؒ کے حکم پر سفر کابل آپ پر حضرت شیخ الہندؒ کے غیر معمولی اعتماد اور بھروسے کا مظہر ہے۔ انگریز کے چنگل سے نکلنے کے لیے آخری دور میں جمعیت علمائے ہند، جس کا اگلی سطور میں تذکرہ ہوگا، نے فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ جمعیت علمائے ہند کی یہ اجتماعیت، ثمرۃ التربیت، جمعیۃ الانصار اور نظارۃ المعارف القرآنیہ کا تسلسل اور نتیجہ تھی۔ ان سب اجتماعیّتوں میں امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا قائدانہ کردار رہا ہے۔ جمعیت علمائے ہند کے اکثر رہنما آپ سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ اور پیچیدہ مسائل کے حل میں آپ سے رہنمائی لیتے تھے۔

www.rahimia.org

اس ضمن میں سربراہ جمعیت علمائے ہند حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے آپ کا ربط وضبط اصل حقیقت کو اجاگر کرتا ہے۔ چناں چہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اپنی زندگی کے آخری دور میں ''نقش حیات'' لکھتے ہیں، جو آپ کی آپ بیتی کے ساتھ ہندوستان کے سیاسی حالات اور زندگی کے مشاہدات وتجربات پر بصیرت افروز تجزیہ وتبصرہ پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں حضرت مدنیؒ نے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک، آپ کے اعتماد یافتہ مخلص لوگوں اور ان کی گراں قدر خدمات کا ذکر کیا ہے۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے بارے میں حضرت مدنیؒ لکھتے ہیں:

''مولانا عبیداللہ صاحبؒ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے خاص فدائی اور نومسلم شاگرد تھے۔ عرصۂ دراز تک خدمت میں رہے تھے۔ سمجھ اور حافظہ نہایت اعلیٰ پیمانے کا اور ہمت و استقلال بے نظیر، قدرت نے عطا فرمایا تھا۔'' (26)

حضرت شیخ الہندؒ سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی گہری اور مضبوط مناسبت کے ضمن میں ایک جگہ حضرت مدنیؒ فرماتے ہیں:

''الغرض حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان (مولانا سندھیؒ) کو بالکل اپنا ہم خیال اور ہم عمل بنالیا۔'' (27)

یعنی حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت سندھیؒ فکروعمل کے لحاظ سے ایک ہوگئے تھے۔ اور دونوں میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ غور کیا جائے تو حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے حوالے سے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی یہ بہت بڑی شہادت ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی عملی جدوجہد میں بے مثال قربانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ لکھتے ہیں:

''مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم آزادیٔ ہند کے نصب العین پر کابل بھیجے گئے، جس مقصد اور نصب العین کے لیے اس جلاوطنی کو ان کے واسطے حضرت شیخ الہندؒ نے مقرر فرمایا تھا، وہ پھولوں کی سیج نہ تھی بلکہ نہایت کٹھن اور کانٹوں سے بھری ہوئی وادی تھی۔ جس میں قدم قدم پر موت کا خطرہ اور مصائب کا انبار تھا۔ مولانا موصوف نے جس جواں مردی اور مستقل مزاجی سے ہلاکت سے بھری ہوئی مصیبتوں کو جھیلا ہے۔ اور ملک و وطن اور تمام ملت ہندوستانی اور مسلمانوں کے لیے جدوجہد کی ہے، وہ صرف ان کا حصہ تھا۔''

اس سفرِ عزیمت کی مشکلات کا تذکرہ کرکے حضرت مدنیؒ، حضرت سندھیؒ کی ثابت قدمی کی بابت یہ گراں قدر جملے تحریر کرتے ہیں:

مگر انھوں نے مایوسی کو راہ نہ دی۔ اور نہ ان کا قدم ڈگمگایا۔'' (28)

www.rahimia.org

مولانا حسین احمد مدنیؒ نے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا ان پرشکوہ الفاظ میں تذکرہ اس کتاب میں کیا ہے، جسے آپ نے حضرت سندھیؒ کی وفات کے تقریباً نو سال بعد 1953ء (29) میں مکمل کیا۔ جس سے حضرت مدنیؒ کی نظر میں حضرت سندھیؒ کے حقیقی مقام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ بھی حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور انھیں اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کا قائم مقام مانتے تھے۔ اور اپنی پختہ رائے کو آپ کی وجہ سے چھوڑ دیتے تھے۔ چناں چہ مکہ مکرمہ سے اپنی واپسی کا اصل سبب بیان کرتے ہوئے خطبۂ صدارت اجلاس علمائے صوبہ بنگال منعقدہ کلکتہ میں فرماتے ہیں:

''حضرت مولانا حسین احمد مدظلہ العالی میرے استاد شیخ الہند قدس سرہ کے قائم مقام یعنی ثانی شیخ الہندؒ ہیں۔ اگر مولانا حسین احمد میری واپسی کی خواہش ظاہر نہ کرتے تو میں بمشکل اس امر پر راضی ہوتا کہ گورنمنٹ ہند سے واپسی میں سہولت پہنچانے کے لیے درخواست کروں۔'' (30)

الغرض حضرت سندھیؒ اور حضرت مدنیؒ کے باہمی اعتماد کے کئی ایک واقعات ہیں۔ چناں چہ حضرت سندھیؒ کی برعظیم آمد کے بعد حضرت مدنیؒ نے ایک خط میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کو لکھا کہ اپنے بڑے صاحبزادہ مولوی حبیب اللہؒ کو اپنے ساتھ اور دوسرے بیٹے مولوی عبید اللہ انورؒ کو حضرت سندھیؒ کے ساتھ مامور کریں، جب کہ وہ اس وقت مظاہرالعلوم سہارن پور میں زیر تعلیم تھے۔ یوں وہ مختلف اسفار میں ہمراہ رہے۔ اسی طرح حضرت سندھیؒ نے مولانا عبیداللہ انورؒ کو حضرت مدنیؒ سے قلبی ذکر سیکھنے کی ہدایت کی۔ اور ان کو بالآخر دارالعلوم دیوبند میں داخل کرایا۔ جہاں انھوں نے حضرت مدنیؒ سے دورۂ حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ (31)

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اپنی مجالس میں حاضرین پر حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا بہت اعتماد بٹھایا کرتے تھے۔ حضرت سندھیؒ 1944ء میں انتقال کر گئے تھے۔ 1365ھ/ 1946ء کا رمضان حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے رائے پور میں کیا تھا۔ چناں چہ 18 اگست 1946ء کی ایک مجلس میں آپ کے سامنے حضرت سندھیؒ کا تذکرہ ہوا تو فرمایا:

''میں نے تو حضرت شیخ الہندؒ سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تعریف سنی ہے کہ وہ بہت مستعد ہیں۔ اور حضرت شیخ الہندؒ ان کی بہت ہی تعریف فرماتے تھے تو اب میرے خیال میں یہ (تجزیہ) ہے کہ مولانا کی بات سمجھنی دشوار ضرور تھی، مگر بات صحیح کہتے تھے۔ ...... حضرت شیخ الہندؒ جس کی تعریف کریں، میں تو ان کے متعلق نیک گمان ہی رکھتا ہوں۔'' (32)

قریب زمانہ کے ممتاز محدث اور استاذ العلما مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے بھی مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو ایک بلند فکر و ہمت شخصیت کے طور پر پیش کیا ہے آپؒ فرماتے ہیں:

''الذکی الفاضل مولانا شیخ عبیداللّٰہ سندھی صاحب الھمة العالیة والعزیمة

www.rahimia.org

الراسخة خدم القوم والملة برهة من عمر والان يقضى حيوته بمكه زادها الله تكريما ومنعه الحكومة الحاضره من العود إلى الهند." (33)

''مولانا عبیداللہ سندھی باصلاحیت، تیز فہم اور ایسے بلند ہمت اور پختہ عزم و حوصلے والے انسان ہیں، جنھوں نے عمر کا ایک حصہ قوم و ملت کی خدمت میں صرف کیا ہے۔ اور آج کل مکہ مکرمہ میں قیام فرما ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے عز و شرف کو بڑھائے۔ موجودہ حکومت انھیں ہندوستان واپس آنے کی اجازت نہیں دے رہی۔''

مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی وفات پر مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی زیر صدارت جمعیت علمائے ہند کے اجلاس (سہارن پور) منعقدہ 6,5,4 مئی 1945ء میں یہ تعزیتی قرارداد منظور کی گئی:

''جمعیت علمائے ہند کا یہ اجلاسِ عام حضرت مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ کے انتقال پُر ملال پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ حضرت مولانا علومِ دینیہ کے ایک فاضل جلیل ہونے کے علاوہ تحریک آزادیٔ وطن کے ان مقتدر علَم برداروں میں سے ایک ممتاز فرد تھے، جنھوں نے آزادیٔ وطن کے لیے ہر قسم کی بیش بہا جانی و مالی قربانیاں پیش کی ہیں۔ اور اس راہ میں پورے استقلال و ثبات قدم کے ساتھ زندگی کے آخری سانس تک نہایت انبساط اور کشادہ دلی کے ساتھ مشغول رہے۔ ان کی وفات سے محبانِ آزادی و فدا کارانِ ملت و وطن کی صف میں جو جگہ خالی ہوئی ہے، اس کا مستقبل قریب میں پُر ہونا بظاہر مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ مولاناؒ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اور ان کی تربت مقدسہ ''قبرِ مبارک'' کو اپنی رحمت کی بارش سے سیراب فرمائے۔'' (34)

واضح رہے کہ اس اجلاس میں مولانا فخر الدینؒ، مولانا احمد سعید سحبان الہندؒ، مولانا محمد میاںؒ، مولانا سید بادشاہ گلؒ سرحدی، مولانا محمد داؤد غزنویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، خان عبدالصمد خانؒ اچکزئی (بلوچستان)، مولانا مفتی محمد نعیمؒ اور مولانا عبدالحق سندھیؒ جیسی شخصیات نے شرکت کی تھی۔

جمعیت علمائے ہند:

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس دور میں وطنی آزادی کی تحریک نے ایک نیا موڑ لیا تھا۔ اور وہ یہ کہ مسلح جدوجہد کی بجائے، عدمِ تشدد اور سیاسی تدابیر کے ساتھ تحریک کو آگے بڑھایا جائے۔ جماعت شیخ الہندؒ اس تمام صورتِ حال کا بغور جائزہ لینے کے بعد جمعیت علمائے ہند کے نام سے علمائے حق کی اجتماعیت کو نئی شکل دیتی ہے۔ اس جماعت کے بانیان اور سرکردہ رہنما وہی لوگ تھے، جو پچھلے دور میں ثمرۃ التربیت کے قیام سے لے کر تحریک خلافت تک آزادیٔ وطن کی خاطر کردار ادا کرتے رہے۔

جمعیت کے زعمائے کرام عام معنوں میں اور پیشہ ور قسم کے سیاست دان نہیں تھے۔ وہ عالم دین تو تھے، لیکن تنگ نظری اور مذہبی تعصّبات سے کوسوں دور تھے۔ وہ کھلے ذہن اور آزاد فکر کے مالک اور روشن خیال تھے۔ جمعیت علمائے ہند کا وجود ہندوستان میں مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر کے اتحاد کی علامت تھا۔ اس کا قیام کانگریس اور لیگ کے درمیان فکر وتوازن کا نقطۂ اعتدال تھا۔

جمعیت کی تاریخ طویل مدت پر پھیلی ہوئی ہے۔ غیر رَسمی تاریخ اس کے قیام سے کم وبیش چالیس برس پہلے 1880ء ثمرۃ التربیت کے قیام سے شروع ہوتی ہے۔ اور اگر اس کے پس منظر کو تلاش کیا جائے تو پہلی نظر دارالعلوم دیوبند کے قیام پر پڑتی ہے۔ اور اگر اس سے اوپر نظر اٹھایئے تو 1857ء کے حوادث کے بعد بزرگانِ دیوبند کے افکار ہمیں اپنی طرف متوجہ کرلیتے ہیں۔ (35)

جمعیت علمائے ہند کے اغراض ومقاصد:

28 دسمبر 1919ء بروز اتوار جمعیت علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس کا پہلا اجلاس زیرِ صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ امرت سر میں ہوا۔ یہ وہ وقت تھا، جب پہلی جنگ عظیم کے بھیانک نتائج ہر جگہ محسوس کیے جارہے تھے۔ بالخصوص اہل ہند انگریز کی مکارانہ پالیسیوں اور دھوکوں سے عملاً آگاہ ہوچکے تھے۔ بنا بریں ایک سیاسی بیداری تھی۔ اور پورا ہند تبدیلی کا خواہاں تھا۔ شیخ الہندؒ سے وابستہ کئی علما کانگریس کی قومی آزادی کی تحریک میں شریک تھے، لیکن علما نے اس قومی جدوجہد میں شرکت کے ساتھ محسوس کیا کہ مذہبی اُمور کی حفاظت اور سیاست میں ان کا الگ تشخص قائم رہنا ضروری ہے۔ اس مقصد کی خاطر جمعیت علمائے ہند کا قیام عمل میں آیا۔ جمعیت کے اغراض و مقاصد بنیادی طور پر دو حصوں پر مشتمل ہیں:

1۔ دینی اور مذہبی اُمور کا تحفظ۔

2۔ قومی جدوجہدِ آزادی میں مؤثر کردار۔

جہاں تک پہلے امر کا تعلق ہے، تو اس حوالے سے اسلام کے درست اور صحیح نظریات کی وضاحت، ملتِ اسلامیہ کی شرعی تنظیم اور محاکم شرعیہ کا قیام، مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی، اخلاقی، معاشرتی اُمور پر سیاسی رہنمائی دینا، جیسے اہم امور جمعیت علمائے ہند کے پیش نظر تھے۔

جب کہ دوسرے پہلو کے لحاظ سے وطنی آزادی کے لیے ہر اس قوت اور اجتماعیت سے اشتراکِ عمل تھا، جو انگریز سے چھٹکارا پانے میں مخلص ہونے کے ساتھ، قومی مسائل کے حل کے حوالے سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے اصول پر یکسو ہو۔ جس میں مشترکہ مذہبی حقوق کی نگہداشت اور مشترکہ مذہبی وملکی ضروریات مقصود تھیں۔ کیوں کہ انگریز مذہبی حقوق میں عدمِ توازن کے ذریعے فرقہ واریت پھیلا کر اپنا اقتدار مضبوط کر رہا تھا۔ اس بنا پر دین کی روشنی

میں صحیح رہنمائی کی ضرورت تھی کہ دینی تقاضوں کے لحاظ اور تکمیل کے ساتھ قومی آزادی کی جدوجہد کو مؤثر انداز سے آگے بڑھایا جائے۔ مذکورہ دونوں پہلوؤں کا بنیادی مقصد دینِ حق کی روشنی میں ہندوستانی سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی مسائل کا ایسا حل تھا کہ ہر حق دار کو حق مل جائے۔ اور کسی پر زیادتی بھی نہ ہو۔ (36)

معروف ارکان:

اس جماعت کی خصوصیت یہ تھی کہ ہندوستان کے ہر اہم علاقے اور صوبے کو نمائندگی دی گئی تھی۔ اور اس میں ہر طبقۂ فکر اور خواص کو شامل کیا گیا تھا۔ البتہ عام مسلمین کو اعزازی ممبر بنایا گیا تھا۔ اس جماعت کے معروف ارکان یہ تھے: مفتی اعظم مفتی کفایت اللہؒ، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، امیر شریعت مولانا محمد سجادؒ، سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ، مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا سید محمد میاںؒ، حکیم محمد اجمل خانؒ، مولانا عبدالماجد بدایونیؒ، مولانا محمد معین الدین اجمیریؒ، مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ۔ (37) علاقائی نمائندگی کے حوالے سے دیگر معروف ارکان یہ تھے:

ممالک متحدہ آگرہ اودھ سے: مولانا محمد فاخر الٰہ آبادیؒ، مولانا محمد سلامت اللہؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، مولانا مظہر الدینؒ۔

بنگال سے: مولانا منیر الزماںؒ، مولانا محمد اکرم خانؒ۔

بہار سے: مولانا رکن الدین دانأؒ، مولانا خدا بخشؒ۔

سندھ سے: مولانا عبداللہؒ، مولانا محمد صادقؒ، مولانا پیر تراب علیؒ۔

پنجاب سے: مولانا سید داؤد غزنویؒ، مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ۔

بمبئی سے: مولانا عبدالمنعمؒ، مولانا سیف الدینؒ، حکیم ابو یوسف اصفہانیؒ، مولانا عبداللہؒ۔

جمعیت علمائے ہند میں ملک کے جید، ممتاز علما اور آزادی پسندوں کا انفرادی حیثیت میں جہاں کردار ہے، وہیں ملک کے معروف مکاتبِ فکر نے بھی بھرپور کردار ادا کیا، جن میں مدرسہ دیوبند کے فضلا کے علاوہ فرنگی محلی، بدایون اور علمائے اہلحدیث کا بطورِ خاص ہمیں تذکرہ ملتا ہے۔ (38)

تحریک شیخ الہندؒ اور خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور:

تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ تحریک شیخ الہندؒ اور خانقاہِ رائے پور ایک ہی حقیقت کے دو رُوپ ہیں۔ چناں چہ تحریکِ شیخ الہندؒ کی بنیادی حکمتِ عملی اکثر و بیشتر خانقاہِ رائے پور میں طے ہوتی رہی۔ اور اگر کہیں دوسری جگہ اہم فیصلے ہوئے تو ان میں مشائخ رائے پور شریک رہے۔ چناں چہ جمعیۃ الانصار جو کہ تحریکِ شیخ الہندؒ کی ابتدائی مگر اہم کڑیوں میں سے ہے، اس کے اصول و قواعد اور مقاصد کے تعین کی مجلس میں شاہ عبدالرحیم رائے پوری

www.rahimia.org

شریک تھے۔ (39) ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تحریک شیخ الہندؒ کے لیے کوئی حکمتِ عملی طے ہوگئی ہو یا کسی حکمتِ عملی پر کام شروع ہو چکا ہو اور مشائخ رائے پور اس سے بے خبر ہوں، بلکہ خانقاہِ رائے پور کے ہر مسند نشین نے ہمیشہ تحریکِ شیخ الہندؒ کے جاری کاموں کی بھرپور تائید و حمایت، بلکہ اس کے حق میں اپنی تمام توانائیاں صرف کی ہیں۔ اور اپنے متعلقین کو ان کی استعداد کے مطابق شریک عمل کرتے رہے ہیں۔ مگر عام کتب اور مجالس میں تحریکِ شیخ الہندؒ اور خانقاہِ رائے پور کے اس تعلق کا تذکرہ اس لیے کم ملتا ہے کہ مشائخ رائے پور کے ہاں ہمیشہ اخفا پیش نظر رہا ہے۔ (40) چناں چہ اس بابت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ایک تحریر لائق مطالعہ ہے:

''حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے اگر چہ اپنے شیخ، قطب عالم حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ اور شیوخِ متقدمین کی تقلید واتباع میں اپنے لیے ایک گوشۂ عزلت کا انتخاب کیا تھا۔ اور جس کا بظاہر صرف سلوک و تربیت سے تعلق تھا، لیکن انھوں نے اس گوشۂ گم نامی میں بیٹھ کر اپنے اسلافِ کرام کی طرح متعدد دینی تحریکوں اور خدمتِ دین اور حفاظتِ اسلام کے مختلف اہم کاموں کی سرپرستی اور رہنمائی فرمائی تھی۔ جن کی تاریخ و روئداد کا بڑا حصہ، آپ کے جذبۂ اخفا اور کارکنوں کی بے توجہی سے اس وقت تک پردۂ خفا میں ہے۔ اور بہت جستجو اور تلاش و تحقیق سے اس کی کچھ کڑیاں دستیاب ہوسکتی ہیں۔'' (41)

حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کا باہمی تعلق چوں کہ ذہنی، فکری اور تحریکی پس منظر رکھتا تھا، اس لیے یہ فکری اور عملی تعلق خانقاہِ رائے پور کا جزوِ لازم بن گیا۔ اور حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے بعد بھی خانقاہِ رائے پور تحریکِ آزادی میں بھرپور کردار ادا کرتی رہی۔ وجہ اس کی یہ کہ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے جانشین مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے دراصل اس فکر و عمل کو محض سطحی نظر سے نہ دیکھا تھا، بلکہ مکمل طور پر جذب کرکے، اسے اپنی زندگی کا لائحۂ عمل بنا لیا تھا، کیوں کہ قطب عالم شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے آپ کا نام ہی نہیں بدلا، کہ ''غلام جیلانی'' سے ''عبدالقادر'' رکھ دیا، بلکہ خصوصی توجہات وعنایات سے آپ کے قلب وقالب، جسم ودماغ، فکر وعمل اور جہد و کردار تک کو بھی بدل ڈالا۔ اور آپ کے تمام رنگ کو اُتار کر اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ یہاں تک کہ آپ شیخ کے ہم شکل اور ان کی عملی مثال بن کر اپنے شیخ کے جانشین ہوئے۔

شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کا جب انتقال ہوا تو اس وقت حضرت شیخ الہندؒ مالٹا میں قید تھے۔ چناں چہ تحریک شیخ الہندؒ کے عملی کاموں کی رہنمائی اور نگرانی بھی شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کر رہے تھے۔ (42) شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ اپنے انتقال سے پہلے یہ ذمہ داری شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کو سونپ گئے۔ چناں چہ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے وصال مبارک کے بعد شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ بہٹ کے نزدیک ''پیلوں'' ضلع سہارن پور میں قیام فرما تھے۔ تو حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ تعزیت کے لیے تشریف لائے۔ مختلف اُمور پر تبادلۂ خیال ہوا۔ دورانِ گفتگو

مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ نے پوچھا کہ: ''شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے شیخ الہند والے کام کی ذمہ داری کسے سونپی؟'' تو اس موقع پر شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور دیگر حاضرین مجلس خاموش رہے۔ سب نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ یہ ذمہ داری بھی شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ ہی کی ہے۔ (۴۳)

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، ان کے جانشین حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ اور شارحِ افکارِ شاہ ولی اللہؒ اور تحریکِ شیخ الہندؒ کے ممتاز رُکن حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کا ایک مشترکہ واقعہ بتاتا ہے کہ تحریکِ شیخ الہندؒ کی یہ وراثت مکمل طور پر خانقاہِ رائے پور میں منتقل ہوگئی:

چناں چہ جب 1928ء میں حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ حج کے لیے حجاز تشریف لے گئے تو آپؒ نے جاتے ہی حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے ملاقات کے لیے آپ کو تلاش کروایا۔ لیکن فوری ملاقات نہ ہوسکی۔ بعد میں حضرت سندھیؒ نے رات کو آ کر حضرت اقدس رائے پوریؒ سے خود ملاقات کی۔ یہ ملاقات بھی بڑی عجیب تھی۔ طویل عرصے کے بعد دو ایسے جدا ہونے والے باہم مل رہے تھے، کہ جنھوں نے آزادی کی جدوجہد میں قربانی دیتے ہوئے یہ جدائی قبول کی تھی۔

حضرت سندھیؒ نے حضرت رائے پوری ثانی قدس سرہ سے فرمایا کہ: ''آپ سے تنہائی میں بات کرنی ہے۔ حضرت اقدس رائے پوریؒ نے تمام حضرات کو اُٹھا دیا۔ اور حضرت اقدس شاہ عبدالعزیز رائے پوری قدس سرہ کو جو کہ اس وقت خادم کی حیثیت میں ساتھ تھے۔ اشارہ کرکے بیٹھے رہنے کا فرمایا۔ جب سب لوگ باہر چلے گئے، تو حضرت سندھی قدس سرہ نے حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ کی طرف دیکھا کہ یہ بھی باہر جائیں، لیکن حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے ان کا تعارف کرایا، کہ قطبِ عالم حضرت اقدس عالی رائے پوریؒ کے یہ نواسۂ حقیقی ہیں۔ اور یہ بھی اس راز کے امانت دار ہیں۔ غرض کہ تخلیے میں ان تین حضرات نے گزشتہ تمام تحریکات کا تجزیہ کیا۔ اور اس سلسلے میں جو مشکلات درپیش رہیں، ان پر سیر حاصل گفتگو ہوئی اور آئندہ اکابرین کے مشن پر کام کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا گیا۔ اور مشکل حالات اور پیچیدہ ماحول کے باوجود آنے والے دور میں راہِ عمل نکالنے کے لیے جس حکمت عملی کی ضرورت تھی، اس کے لیے غور و فکر کیا گیا۔

(اس ملاقات کا نتیجہ تھا) کہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے ہندوستان واپس تشریف لانے کے بعد، حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ کے فکر و عمل کو پھیلانے کے لیے جو کاوش کی اور جس مدبرانہ انداز میں یہاں کے معروضی حقائق کا تجزیہ کرکے آئندہ کے لیے لائحۂ فکر و عمل تجویز کیا، حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ نے اس کی بھرپور تائید کی۔ یہاں تک کہ اپنے خصوصی مرید اور معتمد خاص حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوریؒ (خسر حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ و نانا حضرت شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ) کو بطورِ خاص حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے پاس بھیجا کہ ان کی خدمت میں رہ کر حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہ کی کتابیں

www.rahimia.org

پڑھیں۔ اور حضرت سندھیؒ کی مدبرانہ سیاسی بصیرت سے استفادہ کرتے ہوئے، آئندہ کے لیے کام کرنے کا لائحۂ عمل اور سیاسی مہارت کو سمجھیں۔ چناں چہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوریؒ نے حضرت سندھی قدس سرہ سے خوب استفادہ کیا۔ (44)

حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ اپنے شیخ و مربی قطب عالم حضرت اقدس شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہ کے نقشِ قدم پر ہمیشہ سرگرمِ عمل رہے۔ حضرت عالی جیؒ اپنے سیاسی خیالات، جذبۂ جہاد اور انگریز دشمنی میں چوں کہ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ تھے۔ اور آپ نے شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کو بھی وصیت فرمائی تھی کہ! مولانا محمود حسن صاحبؒ کا ساتھ دیتے رہنا۔ اور سیاسیات میں انھیں سے رجوع کرنا۔ اور مشورے کی ہدایت بھی فرمائی تھی۔ چناں چہ مالٹا سے واپسی کے بعد جب تک حضرت شیخ الہند قدس سرہ زندہ رہے، حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ ان ہی کو اپنا سیاسی مقتدیٰ مانتے رہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی وفات کے بعد تحریک شیخ الہندؒ اور خانقاہِ رائے پور کا یہ سلسلہ پہلے کی طرح قائم اور مضبوط رہتا ہے۔ چناں چہ حضرت شیخ الہندؒ کی تحریک کے عملی وارث حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ مل کر کام کرتے رہے۔ چناں چہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ کے متعلقین میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حضرت اقدس مدنیؒ اپنے متعلقین اور دیگر حضرات کو رائے پور بھیجا کرتے تھے۔ اور شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اپنے متعلقین کو حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ مل کر سیاسی کام میں شرکت کا حکم دیا کرتے تھے۔ چناں چہ آپ نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوریؒ اور حضرت مولانا زاہد حسن صاحبؒ کو خاص طور پر حضرت مدنیؒ کے ساتھ کام کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔

شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے نزدیک دارالعلوم دیوبند کے مرکز میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسا جامع آدمی اور کوئی نہ تھا۔ چناں چہ اس دور کا تجزیہ کرتے ہوئے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ فرماتے ہیں:

> ''ہمارے اس دور میں قحط الرجال ہے۔ کوئی جامع آدمی نہیں۔ دیوبند میں بھی عرصے سے صرف ایک ایک آدمی چلا آتا ہے۔ مگر شکر ہے کہ دیوبند ابھی خالی نہیں ہوا۔ حضرت مدنی جامع آدمی ہیں۔ اور کوئی ہمیں نظر نہیں آتا۔ عرض کیا گیا کہ حضرت مدنی تو لوگوں کو حضرت (آپ) کی طرف بھیجتے ہیں۔ فرمایا: ''دوسروں کی دولت زیادہ معلوم ہوا کرتی ہے۔ یہ حضرت مدنیؒ کی نیک گمانی ہے۔ ورنہ ہم میں کیا رکھا ہے؟'' پھر فرمایا: ''آدمی بڑی مشکل سے بنتا ہے۔'' (45)

قطب الارشاد حضرت اقدس شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ نے ایسے پُرآشوب دور میں یہ کام سنبھالا، جب کہ دینِ اسلام کے تمام شعبوں میں صحیح فہم و بصیرت کے حامل اور اعلیٰ سیاسی شعور رکھنے والے علمائے ربانیین اور قوم پرست رہنمایانِ ملت کے لیے صحیح نہج پر کام کرنا انتہائی مشکل بنا دیا گیا تھا۔ اور مسلمانوں کی رہنمائی کے ایسے

www.rahimia.org

دعویدار پیدا ہوگئے تھے، جو اسلام کے لبادے میں ظالم سامراج کے سیاسی و معاشی فکر و عمل کو پھیلانے، اور سرمایہ پرستی کے نظام کو غالب کرنے کے لیے کام کر رہے تھے۔ اور یوں اسلام کا نام استعمال کر کے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنا کر اپنے گروہی اور طبقاتی مفادات کو حاصل کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اور اس کے لیے ہر طرح کے مکر و فریب اور سازشوں سے کام لے رہے تھے۔ ایسے مشکل اور پیچیدہ ماحول میں آپ نے انتہائی اولوالعزمی سے کام کرتے ہوئے خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور کی بنیادی دعوتِ فکر و عمل اور مرکزی موضوع میں کوئی تبدیلی قبول نہ کی۔ اور خانوادۂ ولی اللّٰہی کے قائم کردہ صحیح فکر و عمل پر انتہائی صبر و استقامت سے کام کرتے رہے۔ (46)

تحریکِ شیخ الہندؒ کے کام سے گہری مناسبت اور عملی کاموں میں شرکت کا نتیجہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کے کئی اعتماد یافتہ لوگ آپ سے اصلاح و تربیت کا تعلق قائم کرتے ہیں۔ ان ناموں میں ایک نمایاں نام حضرت شیخ الہندؒ کے ایک خصوصی شاگرد مولانا خواجہ عبدالحئی فاروقی شیخ التفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا ہے۔ (47) یہ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے قریبی رفقا میں سے ہیں۔ انھیں تحریکِ ریشمی رومال میں کرنل کا عہدہ حاصل تھا۔ (48)

خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور کا مزاج، دین اسلام کے تمام شعبوں شریعت، طریقت اور سیاست، میں تربیت، نگرانی اور سرپرستی کا رہا ہے۔ اسی لیے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے بعد ان کے جانشین قطب الارشاد حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوری قدس سرہ نے بھی اپنے مشائخ کرام کے مزاج کے مطابق اپنے متعلقین کی ان تینوں شعبوں میں بڑی جامعیت کے ساتھ تربیت اور انتہائی تدبر کے ساتھ نگرانی اور پورے فہم و فراست کے ساتھ سرپرستی فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو مزاج عالی خانوادۂ ولی اللّٰہی اور ان کے سلسلۂ عالیہ کے اگلے دور کے مشائخ ’’گنگوہ‘‘ اور ’’رائے پور‘‘ کا رہا ہے۔ اس کا پورا پورا عکس حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوری قدس سرہ کی ذاتِ قدسی صفات میں دیکھا جاسکتا ہے۔ آپ نے انتہائی مشکل، پیچیدہ اور منافقانہ ماحول میں اکابرین مشائخ کے مزاجِ عالی کو محفوظ رکھا۔ (49) حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ، حضرت شیخ الہندؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے سیاسی افکار و نظریات کی ہمیشہ قدر کرتے۔ اور لوگوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرتے تھے۔ چناں چہ ایک موقع پر بعض مفاد پرستوں نے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے افکار توڑ مروڑ کر پیش کیے تو حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے دل میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے بارے میں میل آ گیا۔ ایک مجلس میں حضرت بنوریؒ نے حضرت سندھیؒ کے بارے میں اپنے اس تأثر کا اظہار حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ کے سامنے کیا تو حضرت والاؒ نے حضرت بنوریؒ کو مخاطب کر کے فرمایا:

’’حضرت مولانا! حضرت سندھیؒ ایسے نہیں تھے جیسا کہ لوگ ان کے بارے میں تأثر دیتے ہیں۔ حضرت سندھیؒ بہت اونچی نسبت کے بزرگوں میں سے ہیں۔ ان کے بلند افکار و خیالات کسی کی سمجھ میں نہ آئیں۔ یہ اور بات ہے، لیکن حضرت سندھیؒ، حضرت شیخ الہندؒ کے ایسے اعتماد یافتہ بزرگ ہیں کہ جن کے بنیادی فکر و عمل میں آخر دم تک

کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ (50) آپ ہمیشہ حضرت سندھیؒ کا ذکر بہت بلند الفاظ سے فرماتے اور ان سے منسوب اعتراضات کی نفی فرماتے تھے۔

تحریک شیخ الہندؒ کے پہلے دور کا تجزیہ:

عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ تحریک شیخ الہندؒ اپنے دورِ اول میں اپنے مقصد میں کام یابی حاصل نہ کرسکی اس کا تجزیہ کرتے ہوئے حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں:

''یہاں ایک خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہ شکست کیسے کھا گئے! ہم اپنی پرانی ذہنیت سے اس شبہ سے بہت متاثر رہے۔ اور رو کر کسی کو دو چار جلی کٹی سنا کر اپنا جی ٹھنڈا کر لیتے تھے۔ مگر دورانِ سیاحت جب ہمیں یورپ کی انقلابی تحریکوں کے مطالعے کا موقعہ ملا تو یہ اصول سمجھ میں آیا کہ ایک اعلیٰ انقلاب کے لیے متعدد بار شکست کھانا چنداں بعید نہیں۔ خود اسلام کی ابتدائی تاریخ میں باہمی خانہ جنگیاں پیدا ہوتی رہیں۔ یہ چیز اصل میں انقلابی تحریک کے لوازم میں سے ہے۔ اس کے بعد ہم مطمئن ہوگئے کہ اگر شاہ ولی اللہؒ کی تحریک ایک بار شکست کھا گئی تو یہ حقیقت میں تحریک کی شکست نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم نے اپنے دیوبندی اساتذہ کے کام کو شاہ ولی اللہؒ کی تحریک کا دوسرا دور قرار دیا۔ اس دوسرے دور کو ہم مولانا شیخ الہندؒ کی وفات پر ختم کرتے ہیں۔ اس دور میں بھی تحریک شکست کھا چکی ہے، مگر وہ اپنے نتیجے میں تیسرے دور کے لیے بنیاد تیار کر گئی ہے۔ اور میں اسی امید پر زندہ ہوں۔ اور مجھے اس تحریک کی آخری کام یابی میں کسی قسم کا شبہ و تردد، دامن گیر نہیں۔'' (51)

تحریک شیخ الہندؒ کا موجودہ دور:

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، تحریک شیخ الہندؒ کے تیسرے دور کا آغاز شیخ الہندؒ کی وفات سے شروع کرتے ہیں۔ اس دور کا ایک حصہ 1947ء تک چلا۔ اور پھر اس خطے سے انگریز کے چلے جانے کے بعد ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوئی۔ وہ یہ کہ برعظیم ہند دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک وہ علاقہ، جس پر انڈین گورنمنٹ قائم ہوئی۔ اور دوسرا وہ حصہ جس پر پاکستان قائم ہے۔ ان دونوں علاقوں کے لیے کیا حکمت عملی ہو۔ تحریک شیخ الہندؒ کے سامنے یہ ایک اہم سوال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جماعت شیخ الہندؒ نے اگلے دور اور نئی صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بیدار مغزی اور جواں ہمتی کا ثبوت دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے ہندوستانی نظام کے بگاڑ پر، ہندوستان کے غلام ہونے کی صورت میں ولی اللّٰہی جماعت نے موقع بموقع بہتر سے بہتر ممکنہ حکمتِ عملی بنائی۔

چناں چہ شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے افکار اور حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے افکارِ عالیہ و گراں قدر تجربات، خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور کے چوتھے جانشین

حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری کو منتقل کرتے ہیں۔ حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ العالی کی اسی جامعیت کا نتیجہ ہے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ آپ کے بارے میں یہ گراں قدر جملہ ارشاد فرمایا کرتے تھے: ''مولانا سعید احمد تو واقعی سعید ہیں''۔(52)

وہ اساتذۂ کرام، جن سے آپ نے کسبِ علم کیا، ان میں سے چند کے اسما گرامی یہ ہیں: حضرت مولانا خدابخش صاحبؒ، حافظ مقصود احمد صاحبؒ اور قاری ولی محمد صاحبؒ سے قرآن حکیم حفظ کیا۔ مولانا محمد اشفاق صاحبؒ سے چند کتب اور اپنے والد گرامی حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ سے شرح جامی تک کی کتابیں پڑھیں۔ ان اکثر کتب کا آغاز بانیٔ تبلیغ حضرت مولانا شاہ الیاس دہلویؒ سے کروایا جاتا تھا۔ حضرت مولانا عبداللہ دھرم کوٹیؒ سے جلالین اور حضرت مولانا محمد عبداللہ رائے پوریؒ جامعہ رشیدیہ والوں سے مشکوٰۃ شریف پڑھی۔ آخر میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ کی سرپرستی میں علوم کی تکمیل کی۔ اس دوران مولانا احمداللہ صاحبؒ ناظم مدرسہ مظاہر العلوم اور اس دور کے دیگر اساتذہ سے بھی پڑھا۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ دورانِ تعلیم آپ سے خصوصی شفقت اور عنایات کا معاملہ فرماتے تھے۔ چناں چہ آپ کا کھانا ہمیشہ حضرت شیخ الحدیثؒ کے گھر سے آتا رہا۔ حضرت شیخؒ نے آپ کو ہمیشہ معزز مہمان کی حیثیت میں رکھا۔ دیکھنے والوں کو خیال گزرتا تھا کہ شاید آپ حضرت شیخؒ کے صاحبزادگان میں سے ہیں۔ حضرت شیخؒ کی ان خصوصی عنایات کا نتیجہ ہے کہ حضرت شیخؒ کے زمانہ اور ان کی وفات کے بعد آپ کے متعلقین بالخصوص تبلیغی جماعت کے سربراہان آپ کو نمایاں حیثیت دیتے رہے۔ اور یہ سلسلہ تا حال قائم ہے۔ چناں چہ 2007ء میں جب حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ العالی، رائے پور میں قیام فرما ہوئے تو حضرت مولانا زبیر الحسن اور حضرت مولانا محمد طلحہ حضرت والا کی زیارت کے لیے رائے پور تشریف لائے، تو راقم الحروف اور مجلس میں موجود سب لوگوں نے دیکھا کہ حضرت مولانا زبیر الحسن نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری۔ اور حضرت اقدس رائے پوری مدظلہ کے ہاتھ مبارک پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیے۔ اور ہاتھوں کا بوسہ لیا۔ اور بہت عاجزی اور نیاز مندی سے دعا کی درخواست کی۔ اور جب تک حضرت والا کی معیت میں رہے، بہت خوشی، محبت اور مسرت کا اظہار کرتے رہے۔

حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ العالی کی ذہنی اور فکری تربیت دو حضرات شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوریؒ کی نگرانی میں ہوتی ہے، لیکن آپ کی ذہنی ساخت کے بننے اور سنورنے میں خانقاہِ عالیہ رائے پور کی مجموعی فضا کا بہت بڑا کردار ہے۔ خانقاہِ رائے پور کا جغرافیہ کچھ ایسے ہے کہ مشرق میں نہر بہہ رہی ہے۔ اور شمالاً وجنوباً دو برساتی ندیاں بہتی ہیں، جو خانقاہ کے بالکل قریب مغرب میں جا کر مل جاتی ہیں۔ یوں تو یہ جغرافیہ ایک نہر اور دو ندیوں کا نقشہ ہے، حقیقت میں قدرت کی طرف سے یہ اظہار ہے اس بات کا کہ جیسے صالح فکر کے کئی سوتے ایک جگہ آ کر جمع ہو رہے ہوں۔

واقعاتی اور حقیقی صورتِ حال ایسی ہی ہے، اس لیے کہ خانقاہِ رائے پور وہ مرکز ہے، جہاں ہندوستان کے چوٹی کے علما، محدثین، صوفیا، آزادیٔ ہند کے ممتاز قائدین کا اکثر جانا رہا۔ حضرت شیخ الہندؒ، مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ، مفتی کفایت اللہؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، بانی جماعت تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس دھلویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا سید محمد میاںؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، کے علاوہ سینکڑوں علمائے آزادی، یہاں آکر یا تو مشورے کرتے، آزادی کا پروگرام ترتیب دیتے، یا کسبِ فیض کے لیے حاضر ہوتے۔

اس جنت نظیر ماحول میں حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ العالی اس وقت پہنچتے ہیں کہ جب آپ لگ بھگ پانچ، چھ سال کے بچے تھے۔ کہ آپ کی والدہ محترمہ بچپن ہی میں آپ سے جدا ہوگئیں۔ اور حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے آپ کو اپنا بنالیا۔ اور اس طرح اپنا بنایا کہ ماں کی ٹھنڈی آغوش ثابت ہوئے۔ خانقاہ میں والد گرامی حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ بھی ہوتے تھے، مگر تعلیم و تربیت حتیٰ کہ دینوی ضروریات اور مصارف کے ذمہ دار اور نگران بھی شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ خود بن گئے۔ تزکیۂ نفس اور کمالاتِ باطنی کے تمام مقامات حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی نگرانی میں طے کیے بالآخر 1950ء میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے آپ کو اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اجازت وخلافت مرحمت فرمانے سے پہلے بھی شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ آپ پر بہت اعتماد کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ چناں چہ 1367ھ/1948ء میں پورا رمضان آپ نے حضرتؒ کی موجودگی میں امامت کے فرائض سرانجام دیے۔ حال آں کہ اس رمضان میں خانقاہ کے ممتاز اور جید علما اور بزرگانِ دین حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی صحبت اٹھانے کے لیے جمع تھے۔

اس جنت ارضی کے ماحول میں حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ اکابر کے فکر کو حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے ذریعے سمجھتے اور جذب کرتے ہیں۔ چناں چہ ابھی آپ حصول تعلیم میں مشغول تھے کہ اس دوران حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے آپ کے نانا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوریؒ کے ذریعے ''حزب الانصار'' کے نام سے ایک جماعت بنوائی۔ اس جماعت کے سیاسی، تبلیغی سفر ہوا کرتے تھے، جن کا مقصد اس جماعت کے نوجوانوں کو دین کی جامعیت سے آگاہ کرنا اور اس کے مطابق عملی تربیت دینا تھا۔ تو حضرت اقدس رائے پوریؒ کے حکم پر آپ نوعمری میں اس جماعت کے ممبر بن گئے۔ حضرت اقدس رائے پوریؒ کی سرپرستی اور اس جماعت کے ماحول میں آپ نے دین کی جامعیت، سیاسی ذوق، انقلابی سوچ اور رائے کی پختگی کا اعلیٰ اور اونچا شعور حاصل کیا۔ اس ماحول نے آپ میں بزرگوں کی سوچ سے گہری مناسبت، بلند ہمتی اور جذبۂ عمل پیدا کیا۔ اس جماعت کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''1939ء میں حضرت اقدس رائے پوری کے ایما پر رائے پور میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن

www.rahimia.org

صاحب رائے پوری نے ''حزب الانصار'' کے نام سے ایک سیاسی تبلیغی جماعت قائم کی تھی، جس کا مقصد نوجوانوں میں دین کا جامع شعور منتقل کرنا تھا۔ دین کے فرائض سکھانے کے ساتھ ساتھ عملی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ حزب الانصار کے مطبوعہ اغراض و مقاصد کے مطابق درج ذیل امور پر تربیت دی جاتی تھی:

1۔ کلامِ الٰہی کو سمجھنے، سمجھانے اور عقل و حکمت کو کام میں لانا۔

2۔ خدا کو راضی کرنے کے لیے جہاں تک ہو، نیک بننا۔ اور آپس میں ایک ہو کر نیکی کو دنیا میں غالب کرنا۔

3۔ امن و انصاف کی عالم گیر حکومت قائم کرنا، جو نجات حاصل کرنے میں آسانی پیدا کرے۔

4۔ نیکی کو سمجھنے سمجھانے، عمل میں لانے اور جماعتی زندگی کو مضبوط اور کام یاب بنانے کے لیے خاص اسلامی جذبے سے جان و مال قربان کرنے کی عادت ڈالنا۔

5۔ صحیح اور عملی مقصد رکھنے والی جماعت حزب الانصار میں شامل ہو کر اس کے نصابِ تربیت پر عبور حاصل کرنے کی جان توڑ جدوجہد کرنا۔'' (53)

حضرت رائے پوریؒ اپنے سفر پاکستان کے دوران مجالس میں موجود علمائے کرام کو متوجہ کرتے کہ مولانا سعید احمد کی باتیں سنو۔ چناں چہ حضرت شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ اپنے شیخ کی توجہ سے دین کی جامعیت اور عصری تقاضوں پر گفتگو کرتے۔ اور جب بھی کوئی نوجوان حضرت رائے پوریؒ سے بیعت کرتا تو اسے مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری سے رابطہ رکھنے کی ہدایت فرماتے۔ جب کہ عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے کو حضرت شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ سے تعلق رکھنے کی تاکید فرماتے۔

یوں خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور کے ذکر و اذکار کے نورانی اثرات، شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ کی اونچی صحبت اور حزب الانصار کی اجتماعی کوششوں کا اثر آپ کے خمیر میں رَچ بس گیا۔ اور یہ سب کچھ آپ کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی۔ اپنے شیوخ کی نگرانی میں تربیت حاصل کرنے کا آپ کا یہ سنہرا دور 60 سال پر محیط ہے۔ جس دن سے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کی خدمت میں آپ حاضر ہوئے اس دن سے آج تک زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے شیوخ اور اکابرین کے مشن کی تکمیل کے لیے وقف کیے ہوئے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ العالی کا بنیادی کام نوجوانوں کو دین حق سے روشناس کرانا اور ولی اللّٰہی سلسلے کے اہل حق کا تعارف کرانا ہے تاکہ آج کا نوجوان مغرب کے سرمایہ پرستانہ نظام کے چکاچوند مرعوب کرنے والے ماحول سے نکل کر بصیرت و شعور کے ساتھ دین حق سے منسلک ہو۔ .... اسی کا نتیجہ ہے کہ نوجوانوں میں علمائے حق کی خدمات و افکار کے سلسلے میں دلچسپی روز افزوں ہے۔ اور اسی کے ساتھ ان کی تربیت میں علما کی ایک ایسی کھیپ بھی تیار ہو رہی ہے، جو مستند دینی مدارس سے فراغت کے بعد ان کی نگرانی میں مصروف عمل

www.rahimia.org

ہے۔'' (54)

اُمید کی کرن:

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ جس تیسرے دور کے آغاز اور اس کی کام یابی کی امید باندھے اس دنیا سے رخصت ہوئے، اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی ذمہ داری حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ کے کندھوں پر ڈال کر گئے ہیں۔ شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے فکری اور علمی تربیت کے لیے آپ کو اپنے ساتھ 30 سال تک رکھا۔ اور اکابرین کا فکر اور جذبۂ عمل منتقل کرتے ہوئے ایسی شرابِ طہور آپ کو پلائی ہے کہ اس مشن کی تکمیل کے لیے حضرت اقدس مدظلہ دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ آپ حضرت شیخ الہندؒ کی مالٹا سے واپسی کے بعد کی حکمتِ عملی کے مذکورہ چاروں پہلوؤں کو عصر حاضر میں غلبۂ دین کے لیے ناگزیر تصور کرتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے ارشادات و ملفوظات کا مطالعہ کریں۔ اور حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی دانائی، عالی دماغی، انتھک جدوجہد اور پہاڑ جیسی جرأت و ہمت کا تصور ذہن میں لائیے تو اس کی مجسم شکل اس دور میں حضرت اقدس مدظلہ العالی ہیں۔ اس پیرانہ سالی میں صوفیا کے طریقے پر مسلسل طویل اسفار و مجاہدات کے ذریعے سے صالح سماجی تبدیلی کے لیے روحانی، علمی، شعوری اور فکری تربیت کے ذریعے نوجوانوں میں ولی اللّٰہی فکر منتقل کر رہے ہیں۔ آپ کی شبانہ روز محنت کے نتیجے میں کالج گریجوایٹ جس فکرمندی اور ذمہ داری کا ثبوت دے رہے ہیں، یقیناً شیخ الہندؒ کی روح خوش ہو رہی ہوگی۔ کیوں کہ شیخ الہندؒ اپنے آخری دور میں ''اپنے فکر کے غم خوار کہ جس میں آپ کی ہڈیاں پگھلی جا رہی تھیں'' اس نوجوان اجتماعیت میں تلاش کر گئے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ نے خانقاہِ رائے پور کے مشائخ عظام کے علاوہ حضرت شیخ الہندؒ، حضرت سندھیؒ، حضرت دہلویؒ، حضرت مدنیؒ اور تمام اکابر عزیمت و بصیرت کے فکر کے ابلاغ کا حق ادا کر دیا ہے۔ حضرت والا نے پورے ملک میں باشعور علما اور گریجوایٹس کی ایک ایسی اجتماعیت پیدا کر دی ہے، جو حضرت شیخ الہندؒ کی آخری تمنا تھی۔ یوں حق کی وہ روشنی جو خانقاہِ رائے پور کے ماحول سے آپ کے نفس زکیہ میں منتقل ہوئی تھی، اسے آپ نے ایک بہت بڑی اجتماعیت میں نہ صرف منتقل کیا، بلکہ عصر حاضر کے تقاضوں کا خیال بھی رکھا ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ جس امانت کو علما اور گریجوایٹس کی مشترکہ اجتماعیت میں منتقل کرنا چاہتے تھے اور حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ اپنے علم اور تجربات کو نئی نسل تک پہنچانے کے لیے مکہ مکرمہ سے جو تڑپ لے کر آئے تھے، اس فریضے کو حضرت اقدس مدظلہ پوری قوت سے سرانجام دے رہے ہیں۔ اور حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے جو یہ بات کہی تھی کہ: ''ایک وقت آئے گا کہ دنیا رائے پور کے سیاسی کردار سے اچھی طرح آگاہ ہوگی۔'' (55) یعنی لوگ خانقاہِ رائے پور کی سیاسی اہمیت اور اس کے اجتماعیت پرور کردار اور مزاج کو جان لیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے حضرت

والا نے کر دکھایا ہے۔ اس اجتماعیت کو پاکستان میں آج ''تنظیم فکر ولی اللّٰہی'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے پس منظر پر اگر نگاہ ڈالیں تو ہمیں اس کی تاریخ 1961ء میں ملتی ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے 1961ء کا رمضان خالصہ کالج لائل پور (میونسپل ڈگری کالج فیصل آباد) میں گزارا۔ چناں چہ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے حکم پر زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں آپ نے اپنی جدوجہد کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اور یوں 1967ء میں سرگودھا میں نوجوان طلبا کی تعلیم و تربیت کے لیے ''جمعیت طلبا اسلام'' کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ جب کہ 1969ء میں اس کا مرکزی دفتر لاہور منتقل کر دیا گیا۔

اس جماعت نے بہت قلیل عرصے میں فہم و بصیرت رکھنے والی نوجوانوں کی ایک ایسی اجتماعیت پیدا کر دی، جو گرد و پیش کے حالات پر عقل و شعور کے ساتھ نگاہ رکھنے والی جماعت بن گئی۔ جمعیت طلبا اسلام کی نمایاں کارکردگی سے متأثر ہوکر اور اس جماعت کے مخالفین کے ردّ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بڑے صاحبزادے اور جانشین حضرت مولانا اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے درج ذیل ایک مختصر مگر جامع تحریر صفحۂ قرطاس کے حوالے کی:

> ''اس پُرآشوب دور میں جہاں طلبا کی اپنے اپنے مقاصد کے تحت بہت سی تنظیمیں ہیں، یہ دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ صحیح مقاصد کے تحت ''جمعیت طلبا اسلام'' کے نام سے طلبا کی ایک تنظیم قائم ہے۔ جس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مقاصد میں طلبا کے اذہان میں اسلامی انقلاب لانا ہے۔ اور دوسری بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس جماعت کا سلسلۂ نسبت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور حضرت شیخ الہندؒ سے ہوتا ہوا امامِ انقلاب حضرت شاہ ولی اللہؒ تک جاملتا ہے۔
>
> اور یہ کہ اس جماعت کے سرپرست اور بانی حضرت مولانا صاحبزادہ سعید احمد رائے پوری ہیں، جو کہ قطب عالم شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی امین ہیں۔ مجھے طلبا کی اس جماعت پر پورا اعتماد ہے۔ اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بچوں کو اپنے نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرماوے۔ اور حق پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور ہر قسم کے تشتّت اور افتراق سے محفوظ فرمائے۔'' (56)

تقریباً بیس (20) سال تک جمعیت طلبا اسلام کے نام سے طلبا کی تعلیم و تربیت کا کام ہوتا رہا۔ پھر 1987ء میں تنظیم فکر ولی اللّٰہی کے نام سے اس کام کو آگے بڑھایا گیا۔

حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ العالی چوں کہ دین کی جامعیت اور بزرگانِ دین کے افکارِ عالیہ کی ہمہ جہت ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں، اس لیے آپ نے دینی علوم کی اشاعت کے لیے مزید اداروں کو قائم کیا۔ چناں چہ نوجوانوں میں علومِ قرآنیہ کی تعلیم اور ان کی اساس پر تربیت و تزکیے کے لیے ''ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ'' (ٹرسٹ) لاہور کا قیام 2001ء میں عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے کے تحت قائم دینی تعلیمی نظام قرآن کی

www.rahimia.org

مستند تفسیر، احادیث نبویہ کی مسلمہ تشریح، فقہ، عمرانیات، سیاسیات، معاشیات، تاریخ اور حالاتِ حاضرہ پر قرآنی نقطۂ نظر سے تجزیے پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اور ان اصولوں کی بنیاد پر نوجوانوں کی تربیت کی جاتی ہے۔

2003ء میں ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ سے ملحق مدارس کی تعلیمی ترقی اور معیاری امتحانی نظام قائم کرنے کی خاطر ''نظام المدارس الرحیمیہ'' کے نام سے ایک بورڈ تشکیل دیا گیا۔ جس کے تحت چار سالہ درسِ نظامی کورس پڑھایا جاتا ہے۔ حال ہی میں ادارہ رحیمیہ کی زیرنگرانی ''نظام المدارس الرحیمیہ'' کے تحت ملک کے متعدد شہروں میں ایسے گریجوایٹس جو عملی زندگی میں مصروف ہیں، کے لیے چار سالہ ''علومِ اسلامیہ'' کورس کا آغاز کیا گیا ہے۔ جس میں کافی تعداد میں نوجوان شریک ہو رہے ہیں۔ اس کورس میں تمام دینی علوم، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرتِ نبویؐ، عقائد، تصوف، عمرانیات، سیاسیات، معاشیات کے ساتھ فلسفہ تشریع اسلامی اور حکمت ولی اللّٰہی شامل کیے گئے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ کی زیرسرپرستی ایک مطبوعاتی ادارہ ''شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن'' کے نام سے قائم کیا گیا۔ جس کا بنیادی مقصد اکابرین کی غیر مطبوعہ یا ایسی مطبوعہ تحریرات جو بڑی بڑی کتابوں میں ہیں۔ اور عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہیں۔ یا وہ معیاری اور گراں قدر تحریرات، جو ایک عرصے سے طبع نہ ہو سکی ہوں، کو شائع کرنا ہے۔ اس ادارے نے اب تک ایسی تحریرات پر مشتمل 70 پمفلٹ شائع کیے ہیں۔ اور یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔

تنظیم فکر ولی اللّٰہی، ادارہ رحیمیہ، شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن، نظام المدارس الرحیمیہ دراصل تحریک شیخ الہندؒ کا تسلسل ہے۔ مستقبل کا مؤرخ یہ بات لکھنے پر مجبور ہوگا کہ حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری مدظلہ اور آپ کی محنت سے تیار ہونے والی تنظیم فکر ولی اللّٰہی کا نہ صرف برعظیم پاک و ہند بلکہ پوری دنیا کی جدوجہد آزادی میں نمایاں مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس صالح اجتماعیت کا مفید حصہ بنا کر دنیا و آخرت کی کامیابی نصیب کریں۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات و حواشی

1۔ تحریکِ خلافت، قاضی محمد عدیل عباسی۔ پروگریسو بکس، 40بی اردو بازار لاہور 1991ء۔ ص:48۔

2۔ ہفت روزہ خدام الدین، جلد32۔ شمارہ20۔28 نومبر 1986ء۔ مضمون: ''حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت کے عناصر ترکیبی پر ایک معروضی نظر''، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری۔ ص:15۔

3۔ نقش حیات، مولانا حسین احمد مدنیؒ۔ مکتبہ رشیدیہ۔ ساہیوال۔ ص:655۔

4۔ شیخ الہندؒ کے خطاب کی تجویز مفتی اعظم مفتی کفایت اللہؒ نے دی تھی۔ علمائے حق کے مجاہدانہ کارنامے، مولانا سید محمد میاںؒ۔ تدوین

جدید، ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری۔ جمعیۃ پبلیکیشنز۔ وحدت روڈ لاہور 2005ء۔ص:251۔

5۔ نوٹ: رولٹ ایکٹ میں صاف لکھا تھا کہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی تحریک کو دبانے کے لیے یہ ایکٹ بنایا جاتا ہے۔ اس ایکٹ کے تحت تمام قانونی ضابطوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آزادی پسندوں پر اندھادھند مقدمے چلائے گئے۔ اور سزائیں دی گئیں۔ ستم بالائے ستم یہ تھا کہ ان فیصلوں کے خلاف اپیل بھی نہ ہوسکتی تھی۔

6۔ نقش حیات، ص:667۔

7۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ انگریز سامراج کے خلاف ایک تحریک خلافت 1918ء میں چلی تھی۔ جب کہ 1924ء کی تحریک خلافت کی برطانوی حکومت نے اس مقصد کے لیے حوصلہ افزائی کی کہ اس کے ذریعے انگریز اپنے دشمن غازی کمال پاشا کے خلاف اشتعال پیدا کرنا چاہتا تھا۔ چناں چہ حقیقی آزادی پسند رہنما اس دوسری تحریک خلافت سے لاتعلق رہے۔ غازی کمال پاشا کی وفات پر جمعیۃ علمائے ہند نے دہلی میں اپنے گیارہویں اجلاس (3 تا 5 مارچ 1939ء) میں یہ قرارداد پاس کی تھی: ''جمعیۃ علمائے ہند کا یہ اجلاس مجاہد اعظم غازی مصطفیٰ کمال پاشا، جو ترکی کے استخلاص اور استقلال تام کے روح رواں تھے، کی وفات حسرت آیات پر دلی صدمے کا اظہار کرتا ہے۔ ان کی وفات سے ملت اسلامیہ کا ایک مفکر اعظم اور مجاہد اکبر مسلمانوں سے جدا ہوگیا۔ خدا تعالیٰ غازی موصوف کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ملت ترکیہ کو احیائے قوائے ملت میں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (جمعیۃ علماء ہند، دستاویزات مرکزی اجلاس ہائے عام، مرتبہ پروین روزینہ، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد، 1980ء، 633:2)

8۔ ایشیا کا عظیم انقلابی لیڈر۔ محمد سلمان منصور پوری۔ شاہ ولی اللہ دارالمطالعہ، بشیر بلڈنگ، لاہوری گیٹ، گوجرانوالہ، ص:28۔

9۔ استعماری مظالم اور ملی تقاضے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن، ملتان 1991ء، ص:26۔

10۔ آپ بیتی، باچہ خان کی کہانی خود ان کی زبانی۔ روہتاس بکس۔ احمد چیر 5 ٹیمپل روڈ۔ لاہور، 1990ء، ص:189۔

11۔ ایضاً، ص:140۔

12۔ اختتامی تحریر، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، اجلاس دوئم جمعیۃ علمائے ہند، 21 نومبر 1920ء، دستاویزات جمعیۃ علمائے ہند، مرتبہ پروین روزینہ، 74:1۔

13۔ ایضاً، 75:1۔
14۔ مجلّہ التوحید۔ تہران نمبر 15۔ رجب، شعبان 1405ھ/ 1985ء۔ ص:130,126۔

15۔ نقش حیات، ص:676۔
16۔ جدوجہد اور نوجوان، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ۔ شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن، ملتان۔ ص:7 تا 9۔

17۔ استعماری مظالم اور ملی تقاضے، ص:26,25۔
18۔ النساء:77، 78۔

19۔ علم اور دین داری۔
20۔ استعماری مظالم اور ملی تقاضے، ص:28۔

21۔ انقلابی لیڈر، ص:29۔
22۔ نقش حیات، ص:87۔

23۔ ہجرتِ افغانستان۔ حاجی فیض محمد خان۔ تاج کمپنی لاہور۔ 1971ء۔ ص:30۔

24۔ خطبہ صدارت، مولانا ابوالکلام آزادؒ، اجلاس سوئم جمعیت علمائے ہند، 18، 19، 20 نومبر 1921ء۔ دستاویزاتِ جمعیت علمائے ہند، مرتبہ: پروین روزینہ، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت۔ اسلام آباد۔ 88:1۔

25۔ حضرت شیخ الہندؒ کے عناصر ترکیبی، ص:14۔
26۔ نقش حیات، ص:553، 554۔

27۔ ایضاً، ص:557۔
28۔ ایضاً، ص:597۔

29۔ نقش حیات، ص:692۔

30۔ خطبۂ صدارت اجلاس جمعیت علمائے ہند، کلکتہ، 3 جون 1939ء۔ خطبات و مقالات مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ سندھ ساگر اکادمی۔

www.rahmia.org

اردو بازار لاہور۔ 1996ء۔ ص:85۔

31۔ جانشین شیخ التفسیر مولانا عبید اللہ انورؒ، تحریر ڈاکٹر محمد اکمل بر حواشی وتفسیر قرآن عزیز از حضرت لاہوریؒ، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس 1561۔ کوتانہ سٹریٹ، سوئیوالان، دھلی، ص:55، 56۔

32۔ ارشادات مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری۔ جمع کردہ: مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوری۔ مرتب: مولانا محمد عبداللہ بھکر۔ مکتبہ رشیدیہ۔ 25 لوئر مال۔ لاہور۔ ص:34، 35۔

33۔ یتیمۃ البیان ۔ ضمیمہ مشکلات القرآن۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ۔ ادارہ تالیفات اشرفیہ، بیرون بوہڑ گیٹ۔ ملتان 1937ء۔ ص:44۔

34۔ تعزیتی قرارداد، اجلاس چہاردھم، سہارن پور، 4، 5، 6 مئی 1945ء۔ دستاویزات جمعیت علمائے ہند، 1971ء۔ 2:815۔

35۔ دیکھئے! علمائے حق، ص:223، 224۔

36۔ جمعیت علما کیا ہے؟ مولانا سید محمد میاںؒ۔ مکتبہ محمودیہ۔ کریم پارک۔ لاہور۔ حاشیہ، ص:12۔

37۔ علمائے حق، ص:237، 238۔ جمعیت علما کیا ہے؟ ص:12، 13، 14۔

38۔ جمعیت علما کیا ہے؟ ص:106۔ 39۔ دیکھئے قواعد ومقاصد جمعیۃ الانصار از مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ مطبوعہ دیوبند۔ ص:3۔

40۔ اس بابت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا محمد عاشق الٰہیؒ کی تحقیقات راقم کے مقالہ ''شیخ الہند اور تحریک آزادی'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں، جو شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن کی طرف سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

41۔ سوانح شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ۔ مطبوعہ کراچی۔ ص:690۔

42۔ دیکھئے آپ بیتی، 4:27۔

43۔ یہ روایت حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری خلیفہ مجاز شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ ومسند نشین خانقاہِ رائے پور سے راقم الحروف نے خود سنی۔

44۔ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، مؤلفہ مفتی عبدالخالق آزاد۔ مکی دارالکتب لاہور۔ 1998ء، ص:44، 45۔

45۔ ارشادات حضرت رائے پوری ثانیؒ۔ جمع کردہ: مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوریؒ۔ مکتبہ رشیدیہ، لوئر مال۔ لاہور، ص:232۔

46۔ شاہ عبدالرحیم رائے پوری، ص:37، 38۔

47۔ نفحات طیبہ تلخیص حیات طیبہ۔ ڈاکٹر صاحبزادہ محمد حسین للٰہی۔ مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی۔ کاندھلہ۔ یوپی۔ انڈیا۔ ص:21۔

48۔ تحریک شیخ الہندؒ، ص:398۔ 49۔ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ۔ ص:69۔

50۔ مشائخ رائے پور، مفتی عبدالخالق آزاد۔ دارالتحقیق والاشاعت۔ 32 میکلیکن روڈ۔ لاہور 2006ء۔ ص:138۔

51۔ شاہ ولی اللہؒ اوران کی سیاسی تحریک، مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ الجمعیۃ اکیڈمی، عزیز مارکیٹ، اردو بازار۔ لاہور، ص:115، 116۔

52۔ مجالس حضرت رائے پوری۔ جمع کردہ: مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوریؒ۔ مکتبہ سید احمد شہیدؒ۔ اردو بازار۔ لاہور۔ 1996ء ص:191۔

53۔ حزب الانصار کے مطبوعہ اغراض و مقاصد از مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوریؒ، ص:3۔

54۔ خانقاہ عالیہ رائے پور۔ مفتی عبدالخالق آزاد۔ شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن۔ ملتان، ص:29، 30۔

55۔ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، ص:211۔ 56۔ مشائخ رائے پور، ص:190، 191۔

☆☆☆☆☆☆☆

www.rahimia.org

آرا و تأثرات

گرامے نامے

(1)

Dr. Abdul Rashid

(Sitara-e-Imtiaz)

Meritorious Professor
Faculty of Islamic Studies
University of Karachi

Visiting Research Professor
The Catholic University of America,
Washington, D.C. USA.

محترم مدیر، سہ ماہی ''شعور و آگہی'' لاہور

السلام علیکم!

سہ ماہی ''شعور و آگہی'' کا شمارہ اپریل۔جون 2010ء کی اعزازی کاپی کے لیے ممنون ہوں۔ یہ شمارہ ''حرفِ اول'' سے ''ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ کی ترقیات کی خوش خبری'' تک ایک بہترین علمی و ادبی کاوش ہے۔

''سرگزشتِ حیات مولانا عبیداللہ سندھیؒ'' کے ترجمہ و تحقیق میں آپ نے حقِ تحقیق ادا کر دیا۔ مولانا محمد ناصر کا مضمون ''شیخ الہندؒ اور تحریکِ آزادی'' کئی نئے زاویے لیے ہوئے ہے۔ جو محققین کے لیے نئے ابواب وا کرتا ہے۔

تبصرۂ کتب کے حوالے سے ''اسلام میں مذہبی رواداری'' پر بے لاگ تبصرے کے لیے محمد عباس شاد صاحب قابل مبارک باد ہیں۔

اس شمارے کے مطالعے سے یہ بھی یقین ہو چلا ہے کہ مفتی عبدالخالق آزاد اپنے اکابرین کے حقیقی علمی وارث ہیں۔ امید ہے مفتی صاحب کی علمی کاوشوں سے معاشرہ شعور و آگہی کی نعمت سے مستفیض ہوگا۔ میری چند تصانیف آپ کے ذوقِ مطالعہ کے لیے پیش ہیں۔

دعا گو!

عبدالرشید

www.rahimia.org

(2)

ڈاکٹر محمد عبدالمقیت شاکر علیمی
C-6 شعیب پلازہ، بلاک نمبر 1، گلشن اقبال، کراچی

محترم جناب مفتی عبدالخالق آزاد صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاجِ گرامی، امید ہے کہ حضرت والا بخیر و عافیت ہوں گے۔ آپ نے مقالے کے لیے فرمایا تھا۔ سرِ دست ''شعور و آگہی'' کی مناسبت سے کوئی نیا مقالہ لکھنا ممکن نہیں۔ کچھ مصروفیات زیادہ ہی ہیں۔ ایک مقالہ عرصہ ہوا ''تحریکِ خلافت'' پر لکھا تھا۔ وہی آپ کے رسالے کے لیے مناسب معلوم ہوا۔ اس لیے اس کو از سرِ نو مرتب کیا ہے۔ یوں سمجھیے کہ یہ نئے مقالے کا قائم مقام ہوگیا ہے۔ ذرا طویل مگر ''شعور و آگہی'' کی فکر سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس لیے ارسالِ خدمت ہے۔ اس پر جگہ جگہ نشان ڈال دیے ہیں۔ تاکہ کمپوزر صاحب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ اور بہتر صورت میں کمپوز ہوجائے۔ امید ہے کہ مقالہ پسند آئے گا۔

حضرت والا کی خدمت اقدس میں مؤدبانہ سلام اور خصوصی دعاؤں کی درخواست۔ اہلیہ محترمہ بھی سلام عرض کرتی ہیں۔ اور بچوں کے لیے دعاؤں کی درخواست کرتی ہیں۔ والسلام دعاؤں کا طالب

محمد عبدالمقیت 05 اپریل 2010ء

(3)

Dr. Muhammad Hussain Library,
University of Karachi, Karachi

Date: 03-04-2010

Sir,

We acknowledge with thanks the receipt of Magazine "Quarterly Shaour o Agahi" January-March 2010, issue#1, Vol.#2.

With regards, Your Sincerely

Mrs, Rashida Aman,

Librarian

www.rahimia.org

QUARTERLY

Shauor o Aaghi

Lahore

JULY-SEPTEMBER 2010 Issue # 3 Vol.# 2 Regd.# 370-S

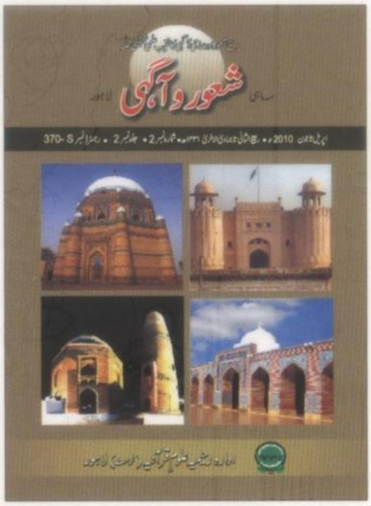

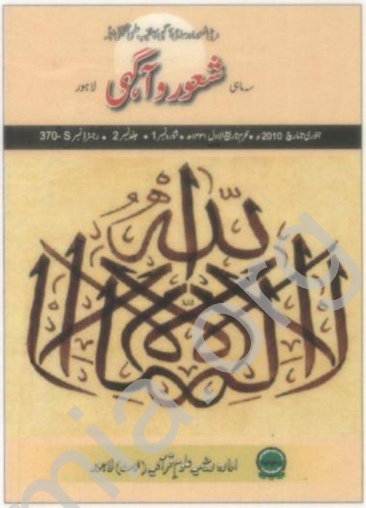

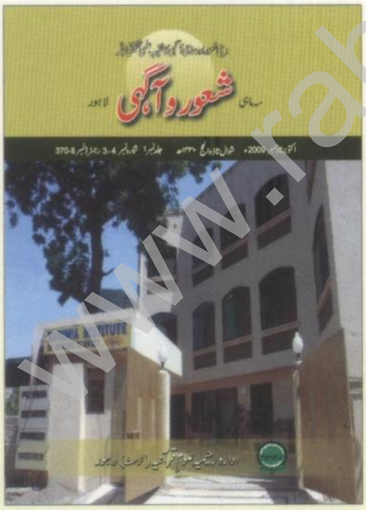

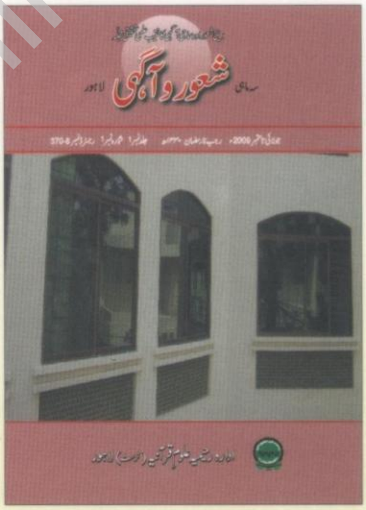

www.rahimia.org

رحیمیہ مطبوعات

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ، شاہراہِ فاطمہ جناح، لاہور